ادھورے چہرے

دیپک بُدکی



چنار پبلی کیشنز

ادھورے چہرے

(افسانے)

دیپک بُدکی



چنار پبلی کیشنز

7/73، منورما وھار، پٹہ بوڑی، تالاب تلّو،

جموں توی۔180002 (انڈیا)

نام کتاب : ادھورے چہرے (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : دیپک بُدکی

قیمت : ایک سو روپے (-/100) بیرون ملک۔ دس ڈالر (-/10$)

اشاعت : پہلا ایڈیشن (مجلد) 1999ء (پانچ سو)

دوسرا ایڈیشن (پیپر بیک) 2005ء (پانچ سو)

ناشر : سندیپ بُدکی، چنار پبلی کیشنز، 73/3 منورما وہار

پٹہ بوڑی، تالاب تلو، جموں توی، 180002 (انڈیا)

کمپیوٹر کمپوزنگ : فہمی کمپیوٹرس اینڈ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی۔۶

مطبع : خواجہ پریس، دین دنیا ہاؤس، ۹۰۰، جامع مسجد، دہلی۔۶

ای میل : deepak_budki@yahoo.co.in

ADHOORE CHEHRE : DEEPAK BUDKI

(A Collection of Short Stories)

Price : Inland : Rs 100.00

Foreign: $10.00

CHINAR PUBLICATIONS

73/7,Manorma Vihar

Patta Bohri, Talab Tilloo, Jammu - Tawi 180002 (India)

انتساب

شریکِ احساس

گائتری

کے

نام

تحریر ظہری

اس مجموعہ کے سبھی کردار، مقامات
اورواقعات قطعی فرضی ہیں۔ کسی شخص،
مقام یاواقعہ سے کوئی مناسبت محض اتفاق
ہوسکتاہے جس کے لئے مصنف یاناشر
پر کوئی ذمّے داری عاید نہیں ہوگی۔

سپاس نامه

میں ان سب مدیر حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری کہانیوں کو اپنے گرانقدر رسالوں اوراخبار وں میں جگہ دے کرمیری حوصلہ افزائی کی۔ یہ کہانیاں مندرجہ ذیل رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔

رشتوں کا درد (شاعر ممبئی مارچ ۱۹۹۹ء، سخنور کراچی مارچ ۲۰۰۰ء)، جاگو (تعمیر سرینگر ۱۹۷۵ء، اثبات ونفی جولائی تادستمبر ۱۹۹۸ء، صدالندن ۲۰۰۳ء)، بٹی ہوئی عورت (تعمیرسرینگراگست ستمبر ۱۹۹۹ء، سب رس جنوری ۲۰۰۰ء)، کینچلی (رفتارجموں)، ڈرفٹ وڈ (بادبان کراچی، سالنامہ ۹۸،۹۷) (انشاء کلکتہ، مئی وجون ۹۸ء)، ڈائننگ ٹیبل (اسباق، پونہ، جنوری تاجون ۹۸ء) (پندرھویں صدی نئی دھلی فروری ۲۰۰۰ء)، ادھورے چھرے (تعمیرھریانہ، چنڈی گڑھ) (انشاء، کلکتہ، مئی جون ۹۹ء)، خودکشی (گلکدہ اکتوبر تادسمبر ۹۸ء) (گلبن)، ایک ھی خط (خوشبو کاسفر، حیدر آباد، دسمبر ۹۸ء) (ملاپ نئی دھلی۔ ۳۰ جنوری ۲۰۰۰ء)، کالا گلاب (خوشبو کاسفر، حیدر آباد، جولائی ۹۸ء) (سفیراردو لندن افسانہ نمبر ۲۰۰۰ء)، ادھ کھلی (بیسویں صدی، نومبر ۹۸ء) (انتساب شمارہ ۳۴۔۳۵)، بیسوا (گلبن، احمد آباد، ستمبروا کتوبر ۹۸ء)، اچانک (رنگ وبوحیدرآباد، نومبر ۹۹ء)، بکھرے ھوئے لمحوں کا سراب (سب رس حیدر آباد اگست ۹۹ء) (بیسویں صدی اپریل ۲۰۰۰ء) ریزے (خوشبو کاسفر، حیدر آباد، اکتوبر ۹۹ء)، راکھ کا ڈھیر (رنگ وبوفروری ۲۰۰۰ء) (ملاپ نئی دھلی ۱۹ دسمبر ۹۹ء) (محفل صنم دھلی)

اوپر دی گئی لسٹ میں ان مقامی اخباروں کا نام نہیں ھے جن میں یہ کہانیاں ستّر کے دھے میں چھپ چکی ہیں کیونکہ اس کا ریکارڈ اب میرے پاس نہیں ھے۔

مجموعے کی ترتیب وتزئین میں کئی اشخاص نے میرا ہاتھ بٹایا جن

کا فرداً فرداً نام لینا ممکن نہیں البتہ مجموعی طور پر میں ان سب احباب کا ممنون ہوں۔ انیس رفیع اور ظفر اقبال ظفرؔ سپاس کے خاص طور پر مستحق ہیں کیونکہ انھوں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ مجموعے کی کمپیئٹرنگ میں محمد اکبر میر اور برج بھاری نے میری مدد کی۔ علاوہ ازیں جناب نریندر ناتھ سوزؔ، ناشر اور پرنٹر نے پہلے ایڈیشن کو منظر عام پر لانے میں بڑی محنت اور لگن سے کام کیا۔ ان سب کا شکریہ ادا کرنے کے بغیر یہ سپاس نامہ ادھورا رہے گا۔ البتہ یہاں پر یہ بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری ناتجربہ کاری اور کاہلی اور ناشر کے آشواسن کے سبب پہلے ایڈیشن میں بہت ساری غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اغلاط نامہ لگانے کے باوجود وہ بات نہیں بن سکی۔ میں نے دوسرے ایڈیشن میں اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے ایڈیشن کو منظر عام پر لانے کے لئے میں جناب آصف فھمی پراپرائٹر خواجہ پریس دھلی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس مشکل کام کو میرے لئے آسان کر دیا۔ میں ان تمام حضرات کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے 'ادھورے چھرے' کے پہلے ایڈیشن کو سراہا اور اپنی رائے سے نوازا۔ خاص طور سے میں قتیل شفائی (مرحوم) اور آنجھانی ھرچرن چاولہ کا تھہ دل سے شکر گزار ہوں کہ ان کے زریں تاثرات نے اس ناچیز کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ میں ان ایڈیٹروں کو کیسے بھول سکتا ہوں جنھوں نے اپنے گراں قدر سالوں اور اخباروں میں پہلے ایڈیشن پر ریویو شائع کئے۔ آخر میں اپنے دوست ڈاکٹر انور ظھیر انصاری کا بھی شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے میرے کام کو سراہا اور پہلے ایڈیشن پر نظر ثانی کی۔

دیپک بُدکی

فہرست

حرفِ اوّل

سابق لیفٹننٹ کرنل اور موجودہ پوسٹ ماسٹر جنرل دیپک بُدکی کے 'ادھورے چہرے' میں شامل افسانے حرف اوّل تا آخر پڑھے۔ پڑھ کر مسرت آمیز حیرت ہوئی۔ ایم ایس سی کے بعد اردو سیکھنے والا نامساعد حالات میں گھِرا ایک غیر اردو داں اردو کی محبت میں بے خطر اس دشت میں کود پڑا جس کی سیاحی کی تاب مجنوں جیسا دیوانہ ہی لا سکتا ہے۔ بُدکی نے اپنی اوّلین صنفی تحریر سے متعلق پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے کہ وہ نصف ہندی اور نصف اردو میں تھی کہ ان دنوں اسے دونوں زبانوں پر دسترس حاصل نہ تھی۔ بٹوارے کے بعد خطہ گنگ و جمن میں اردو کو منتخب کرنا اگنی پریکشا دینے کے مترادف تھا۔ بُدکی نے شوق جنوں میں وہ پریکشا دی۔ اور اب کامیابی کی اس منزل پر ہے جہاں اسے صاحب کتاب ہونے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔

بُدکی کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس کی آپ بیتی کے ٹکڑے ہیں جو الگ الگ عنوان سے رقم ہو کر بغیر کسی کوٹنگ Coating کے ہم تک پہنچائے گئے ہیں۔ زندگی کے تجربات جب داستان بنتے ہیں تو انہیں واقعی کسی جیکٹ Jacket کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بلا تمہید و تصنع اپنے نشانے Target پر جا پہنچتے ہیں۔ افسانوں کے واقعات، سچویشن اور کہانی کی رو سے متصادم ہو کر ان کا قاری شاید اسی بنا پر بکھرتا نہیں ہے بلکہ ان کا شریک ہو جاتا ہے۔ اور یہی شرکت فن کار اور فن پارے کی انفرادیت اور پہچان Identity کا موجب ہوتی ہے۔ مثلاً ان کے تین افسانے ڈرفٹ وڈ، بٹی ہوئی عورت اور ادھورے چہرے کو ہی لے لیجئے۔ ان میں متوسط طبقے کے جنسی رویے (Sexual sensibilities) کے تین درجات کا بیان بڑی سادگی اور کسی

حد تک کھلے پن سے ہوا ہے۔ مگر انہیں پڑھ کر قاری کسی نفسانی شدت میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ خود کو کسی کردار کے ساتھ Identify کرتے ہوئے کہانی میں شریک ہو جاتا ہے۔

کئی افسانے اس کتاب میں اپنی سادہ بیانی اور کھردرے پن کے باعث ممکن ہے آپ کو پل بھر کے لیے بے وجہ لگیں مگر ان میں جو Issues اور نفسیاتی پہلو ہیں باخبر ذہنوں اور پختہ سماجی شعور رکھنے والوں کے لیے غور و فکر کے لمحات پیدا کرتے ہیں۔ جاگو، ایک ہی خط، کالا گلاب، اور کینچلی مثبت قدروں کی پامالی، سماجی و اخلاقی بحران سے پیدا شدہ خطرات کا اشاریہ ہیں۔ ہمارے سروں پر منڈلاتے خطرات کسی طور آدم زادوں کی اس بستی کو پرامن رہنے نہیں دینا چاہتے۔ ان افسانوں کے توسط سے ہمیں جو آگہی ملتی ہے کسی طور پر بے وجہ نہیں۔

بُدکی اپنی طرح کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو افسانوں میں نفسیاتی گرہوں اور غیر ضروری تہ داری کے قائل نہیں۔ افسانہ بیان کرتے وقت انہیں ہر لحظہ یہ خیال ہے کہ افسانے میں موجود message ماند نہ پڑے۔ اور پڑھنے والے کے دل و دماغ تک بے لاگ پہنچے۔ ممکن ہے افسانے کے ناقدین کو اس بات پر اعتراض ہو کہ افسانے کا منصب محض messenger کا نہیں بلکہ اس سے سوا بھی ہے۔ ان کے نزدیک جمالیاتی تشفی، یک گونہ قلبی مسرت بخشنا بھی فن پارے کے لیے ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تشفی اور مسرت قارئین کے کورٹ کا معاملہ ہے۔ اس کا فیصلہ اسی عدالت کے ذمّے ہے۔ مجھ جیسا تیسرا اس کا اہل نہیں۔

میں بُدکی صاحب کو صاحبِ کتاب ہونے کی مبارکباد دیتا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

انیس رفیع

ڈائریکٹر دوردرشن (ریٹائرڈ)

ڈبروگڑھ، آسام

پیش لفظ۔ دوسرا ایڈیشن

'ادھورے چہرے' کے پہلے ایڈیشن پر آج تک جتنے بھی تبصرے چھپے ان سب کو پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ ان افسانوں کے بارے میں مجھے کچھ کہنا باقی رہ گیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پہلے ہی ایڈیشن میں مجھے اپنی بات وضاحت کے ساتھ پیش کرنی چاہیے تھی مگر طوالت کے مدنظر میں نے گریز سے کام لیا۔ بہر حال اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ انگریزی کے ایک ادیب نے سچ کہا ہے کہ مصنف ہونے کے ناتے اپنی تخلیقات پر مجھ سے زیادہ اور کون روشنی ڈال سکتا ہے۔

اس مجموعہ میں مشمول افسانے سن ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۹ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ انتیس سالوں کا یہ سفر کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس دور میں کئی ادبی تحریکوں نے جنم لیا اور آہستہ آہستہ دم توڑ دیا۔ گو میں نے ان تحریکوں سے اپنے آپ کو حاجز (Insulate) کرنے کی کوشش کی تاہم ان کے اثرات سے بچنا محال تھا۔ 'جاگو' اور 'ادھورے چہرے' میں اس دور کے رجحانات صاف طور پر دکھائی دیں گے۔ 'جاگو' کے بارے میں کئی نقادوں نے یہاں تک کہا کہ یہ سرے سے افسانہ ہے ہی نہیں۔ بات دراصل یوں ہے کہ یہ افسانہ ایمرجنسی کے دوران قلمبند کیا گیا۔ اُن دنوں حاکم وقت معمولی تنقید بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس لیے مجھے تجریدی طرزِ تحریر سے کام لینا پڑا۔ اس کہانی کا راوی ایک پڑھا لکھا بے روزگار آدمی 'موسیٰ' ہے جو ناسازگار حالات کی تاب نہ لاکر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ موسیٰ تواریخ کی تلخ حکایتوں اور انسانی ایذا پسندی (masochistic behaviour) کی روایتوں

کو کنایوں، استعاروں اور تلمیحات کے ذریعے ہم تک پہنچاتا ہے۔' جاگو' کا آدم ایک جانب معصوم ہے اور دوسری جانب گناہ گار جبکہ اس کا خالق ایک طرف رحیم ہے اور دوسری طرف قہار۔ اس پر طرہ یہ کہ آدم بار بار گناہ کرنے سے باز نہیں رہتا کیونکہ اسے یقین دلایا گیا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد وہ ہر بار توبہ کر کے بچ سکتا ہے۔ توبہ، پریشر ککر کے سیفٹی ویلو کا کام کرتا ہے۔ ماضی میں اسی آدم نے فرعون، موسیٰ، نمرود، عیسیٰ، ہٹلر اور گاندھی کے متضاد رول نبھائے ہیں اور ایمر جنسی کے دوران اس نے چنگیز خاں کی قبا پہن لی۔ اس کے باوجود مراجعت کی امیدیں آدم کے دل میں اب تک برقرار ہیں۔ اس کہانی کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ راوی دیوانگی کی حالت میں ہی اپنے وجود اور ہستی کے بارے میں بار بار خدا کے حضور میں کئی سوال اٹھاتا ہے کیونکہ وہ کسی بھی روایت سے مطمئن نہیں ہے۔

ایلوِن ٹوفلر کی تصنیف 'فیوچر شاک' (Future Shock) نے 'ادھورے چہرے' کی بنیاد ڈالی۔ ٹوفلر کا ماننا ہے کہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ہم ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں دیگر اشیاء کے ساتھ ہمارا واسطہ عبوری اور غیر مستقل ہو کر رہ گیا ہے۔ رشتے ناطے عارضی اور ہنگامی بن کر رہ گئے ہیں۔ اس تمدن کو ٹوفلر نے 'اتار پھینک کلچر' (Throw away Culture) کا نام دیا ہے جہاں استعمال شدہ چیزوں جیسے کاغذی گلاس اور پلیٹ، پلاسٹک کی بوتلیں وغیرہ کو دوبارہ استعمال کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جہاں اجنبی لوگ دیکھتے ہی دیکھتے رشتے دار بن جاتے ہیں۔ اور اصلی رشتوں کا خون حالات بدلتے ہی سفید ہو جاتا ہے۔ انجام کار انسان اس بھری دنیا میں تنہا رہ گیا ہے۔ ایک جانب کمسن نتاشا اکیلے پن سے گھبرا کر بھائی بہن ڈھونڈ رہی ہے، دوسری جانب ڈاکٹر سونیتا نرینہ عصبیت Male chauvanism کے باعث گھر کی چار دیواری میں دنیا و مافیہا سے کٹ کر رہ گئی ہے۔ حیرت تو اس بات کی ہے کہ سونیتا کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی توضیع ہر کوئی اپنے ہی انداز میں کرتا ہے۔ نتاشا کے پتا جی اس خلا کی علت غائی جنسی ان

میل Sexual dissatisfaction کو گردانتے ہیں لیکن اپنی نابالغ بیٹی کے سامنے اس حقیقت کو بیان کرنے کی ہمت نہیں جٹا پاتے۔ بدلے میں وہ کوئی اور ہی دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ سونیتا کی اولوالعزمی اور جاہ طلبی کو اس خلا کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس کے برعکس نتاشا کی ان پڑھ ماں سونیتا کو مامتا کی ملائم عینک سے دیکھتی ہے۔ اس کا یقین ہے کہ سونی کوکھ ہی سونیتا کے ادھورے پن کا سبب ہے۔ وہ ہر دم بچے کی تلاش میں رہتی ہے۔ خود کمسن نتاشا یہ سمجھتی ہے کہ سونیتا آنٹی کو اپنے بچپن کے بوائے فرینڈ کا انتظار رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر شخص ایک ہی پرابلم کو اپنے مخصوص تجربے کے تناظر میں دیکھتا ہے اور اس کی الگ الگ تشریح کرتا ہے۔

کئی نقادوں نے رائے ظاہر کی ہے کہ اس مجموعے میں شامل کہانیاں میری زندگی کا درپن ہیں۔ میں اس رائے سے نہ تو کلی طور پر اتفاق کرتا ہوں اور نہ ہی انکار۔ اکثر و بیشتر کہانی لکھنے سے پہلے میرے ساتھ کہیں کوئی حادثہ ضرور گھٹتا ہے جو مجھے کہانی لکھنے کی تحریک عطا کرتا ہے لیکن میں اس واردات کو من وعن بیان نہیں کرتا نہ ہی اس کی فوٹوگرافی کرتا ہوں بلکہ اسے متاثر ہو کر ایک خیالی اور تصوراتی قصے کا تانا بانا بن لیتا ہوں جو میرے علم اور تجربے کے تعامل سے افسانے کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ اس طرح میری کہانی حقیقت سے جتنی قریب ہوتی ہے اتنی ہی اس سے بعید بھی ہوتی ہے۔ رشتوں کا درد، ہی کو لیجے۔ اس افسانے کو تین مختلف وارداتوں نے مل کر جنم دیا ہے۔ اسی طرح کینچلی کا محرک نہ صرف راجہ مہاراجوں کے پروی پرسز Privy Purses کا بند ہونا تھا بلکہ ایسے طبقے کی ایک عورت سے چند منٹوں کی اتفاقیہ ملاقات بھی تھا۔ ڈرفٹ وڈ، کی سُمن مجھے کئی بار کئی صورتوں میں ملی۔ وہ کسی مخصوص طبقے سے تعلق نہیں رکھتی۔ البتہ یہ سچ ہے کہ اُس کے اس مخصوص روپ نے مجھے بہت متاثر کیا۔

افسانہ 'خودکشی' کا تھیم ہم عصر زندگی کا ایک اہم موضوع ہے جس کو انگریزی میں

Euthanasia (مخلصی موت) کہتے ہیں۔ یہ کہانی بہت سال پہلے لکھی گئی تھی تاہم حال ہی میں آندھراپردیش کے ایک بیمار لڑکے اوراس کے والدین نے اس مخلصی موت کے لئے سپریم کورٹ میں فریاد کی تھی۔ اس کے برعکس 'ایک ہی خط' کی بیمار لڑکی اپنے ڈاکٹر عاشق کو اپنا فرض یاد دلاتی ہے اور تنبیہہ کرتی ہے کہ وہ کبھی بھی مریضوں کی زندگی سے کھلواڑ نہ کرے۔

افسانہ 'ڈرفٹ وڈ' (Drift Wood) ایک معصوم لڑکی کی امنگوں اور مسکراہٹوں کا مدفن ہے۔ وہ اپنے ہی باپ کے استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ دنیا میں تذویج محرمات (Incest) کی وارداتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں مگر اکثر وبیشتر بدنامی اور مکافاتی کارروائی کے ڈر سے منظر عام پر نہیں آتی ہیں۔ اسی ضمن میں جتنی سنسنی خیز خبریں ذرائع ابلاغ کے توسل سے ہمارے پاس پہنچتی ہیں ان کا تناسب اصل وارداتوں کے مقابلے میں محض پانچ فیصدی ہوتا ہے جبکہ پچانوے فیصد معاملے رفع دفع کئے جاتے ہیں۔ اہانت اور ذلالت کی تاب نہ لاکر عام طور پر ایسے کردار یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر اندر ہی اندر گھٹ کر ذہنی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس سُمن کا ردِ عمل بالکل مختلف ہے۔ ایسی حالت میں دوسری لڑکیاں عموماً خود سے حقارت کرتی ہیں اور پھر پستی کی گہرائیوں میں گر جاتی ہیں جبکہ سمن لذت پسند زندگی Hedonistic way of life اختیار کر کے خود کو ڈرفٹ وڈ کی مانند دریا کی موجوں کے حوالے کر دیتی ہے وہ مردوں کو آلہ کار بنا کر اپنی زندگی کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ اس کے لئے باپ، بوائے فرینڈ اور ایمپلائیر سبھی سیڑھی کے ایسے پائیدان ہیں جن کو وہ خوشی خوشی پھلانگتی رہتی ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سمن کے مجروح ومضروب دل میں پھر بھی اپنے باپ کے لیے بے انتہا پیار اُمڈتا رہتا ہے۔ باپ کے بغیر وہ اپنے وجود کو نامکمل سمجھتی ہے۔

'کینچلی' مابعد آزادی کے ہندوستانی مسلمانوں کے مخصوص فرقے کی کہانی ہے۔

پاکستان کے وجود میں آنے سے اس فرقے میں بیگانگی، محرومیت اور لاتعلقی
alienation کا احساس پیدا ہو گیا۔ 'اللہ کا انتظار' Waiting for Allah میں
کرسٹینا لیمب رقم طراز ہیں "پاکستان کا نعرہ مسلمانوں کے امیر اور جاگیردارانہ طبقے نے
اپنے اقتدار اور اس سے جڑی ہوئی آسائشوں اور سہولتوں کو برقرار رکھنے کے لئے لگایا کیونکہ
انھیں یہ غم ستانے لگا تھا کہ جن لوگوں پر انہوں نے برسوں حکومت کی وہی آزادی کے بعد ان
کے حکمراں بن جائیں گے۔ انہیں ایسے لوگوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنا پڑے
گا۔ جبکہ عام مسلمانوں کے لیے یہ تغیر کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اسی لئے یہ طبقہ چھٹپٹا تا رہ
گیا۔" ہندوستان کے نواب اور راجے اپنے رفیع الشان ماضی کے بل بوتے پر اپنی زندگی
بغیر کسی جدوجہد کے عیش وعشرت میں گذار رہے تھے۔ ہم عصر زندگی میں ان کا کوئی یوگدان
نہیں تھا۔ انہیں اس کینچلی کو اتار پھینکنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

'رشتوں کا درد' آج کے کرم خوردہ سماج کی تصویر ہے جہاں جھوٹ مکروفریب اور جرائم
کا بول بالا ہے اور خلوص، دیانت داری اور مثالیت پسندی کی کوئی قدروقیمت نہیں۔ اس
سماج کے رکن اپنے چہرے پر مکھوٹے Masks چڑھا کر نہ صرف عام لوگوں کو بلکہ آپس
میں ایک دوسرے کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ یہ ایسا سماج ہے جہاں مجرم بری ہوتے ہیں
اور معصوم تختہ دار پر لٹکائے جاتے ہیں۔ 'ڈائننگ ٹیبل' حقیقت پر مبنی کہانی ہے جس میں قلم
کار کو اتفاق سے ایک پولیو زدہ لڑکی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ یہ طے نہیں کر پایا کہ اسے کیا کرنا
چاہیے۔ اس کی حالت غالب کے اس شعر میں مضمر ہے۔

ے ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

اس کے برعکس 'بیسوا' میں مجید ثابت قدمی کا ثبوت دے کر اور سماج کی پرواہ کئے بغیر
ایک ویشیا کو اپنا جیون ساتھی بنا لیتا ہے۔ اسی طرح 'کالا گلاب' دو ننھے منے بچوں کی کہانی ہے

جو دنیا کی لالچوں کو ٹھکرا کر اپنے پیار کو ترجیع دیتے ہیں۔

'اچانک' بھی انسانی ہمدردی کی ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک سادہ لوح بے رعونت ہندو طالب علم ایک مسلمان لڑکی کی جان بچانے کی خاطر اپنی زندگی قربان کرتا ہے۔ اس کہانی کو شردھانجلی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

'ادھ کھلی' ایک تاثر ہے جو میری فوجی زندگی سے وابستہ ہے۔ مزدور طبقہ سے تعلق رکھنے والی ایک معصوم کلی کے چٹخنے اور بکھرنے کی درد بھری داستاں، مجبورئ روزگار کے باعث نہتی عورتوں کے استحصال کی کہانی جس کی بازگشت چند سال پہلے امریکی وہائٹ ہاؤس میں بھی سنائی دی۔

تین طلاقوں پر ہمارے ملک میں آئے روز چرچا ہوتا ہے۔ مسلم معاشرے پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ 'بٹی ہوئی عورت' میں تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا گیا ہے۔ جہاں ہندو سماج میں آسانی سے طلاق نہ ملنے کے باعث پیدا ہو رہی برائیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کہانی میں لاجونتی اپنے مجروح و مضروب بچپن کا احساس گناہ دل میں لئے ہوئے اپنے مستقبل کو غیر یقینی بنا دیتی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے باوجود آپس میں جڑے رہتے ہیں کیونکہ ہندو سماج میں طلاق لینا کوئی آسان کام نہیں۔ 'بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب' کی شلپی نرینہ عصبیت کو ماننے سے انکار کرتی ہے اور جوکھم اٹھا کر اپنا الگ راستہ چن لیتی ہے۔ خوش قسمتی سے کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ دوسری جانب 'ریزے' کی عورت زندگی کو مفاہمت اور اشتراک سمجھتی ہے۔ وہ زندگی کی کڑواہٹوں کو گلے لگا کر ان سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ مجموعے کا آخری افسانہ 'راکھ کا ڈھیر' ایک آرٹسٹ کی کلپنا ہے۔ زندگی، پیار اور موت کے بارے میں اس کا ردعمل ہے۔ اس کے کینواس بولتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ آرٹسٹ روی جیکر کا تخلیقی سفر، فلائٹ ان ٹو ان نون، Flight into Unknown سے شروع ہو کر 'دی فال' The fall سے گزر کر 'راکھ کا ڈھیر' تک ارتقائی

ادھورے چہرے

منزلیں طے کرتا ہے اور آخر الذکر شاہکار کے ساتھ ہی اس کے اندر کا آرٹسٹ دم توڑتا ہے جبکہ خود روی جیکر زندہ رہتا ہے۔

میرے افسانوں میں جا بجا مقصدیت نظر آئے گی کیونکہ میرا یہ ماننا ہے کہ انٹلکچول طبقہ ہی قوم کی رہنمائی اور دستگیری کر سکتا ہے۔ تاہم میں نے نہ تو تبلیغ سے کبھی کام لیا ہے اور نہ ہی ناصح بننے کی کوشش کی ہے۔ میں نے بس کہانی کو کہانی رہنے دیا ہے۔

دیپک بُدکی

بمقام پانا جی، گوا

تاریخ ۲۲ر جنوری ۲۰۰۵ء

پیش لفظ - پہلا ایڈیشن

میری ادبی زندگی کا آغاز سن ۱۹۷۰ء میں افسانہ 'سلمیٰ' سے ہوا جو روز نامہ 'ہمدرد' سرینگر کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ دراصل اس سے قبل جون ۱۹۶۸ء میں کچھ ایسے حالات وقوع پذیر ہوئے تھے جن کی وجہ سے مجھے قلم اٹھانے کی تحریک ملی۔ نظریاتی تناؤ، عدم تحفظ اور عدم توافق کے سبب جو جوالا مکھی میرے اندر سالہا سال سے کروٹیں لے رہا تھا وہ آخر کار ایک دن پھٹ کر صفحۂ قرطاس پر کالے حروف کے بھیس میں پھیلتا چلا گیا۔ قریبی وجہ تھی پھوپھیرے بھائی کی بے وقت موت۔ اسی رات میں نے ایک جذباتی ڈرامہ 'بندھن' لکھا جو اسٹیج تک آنے سے پہلے ہی ورق ورق بکھر گیا۔ اُس وقت مجھے اُردو سے پوری واقفیت تھی نہ ہندی سے۔ سائنس اسٹوڈنٹ ہونے کے باعث اُردو یا ہندی صرف بطور اختیاری مضمون لیا جا سکتا تھا۔ اس طرح اُردو پانچویں میں چھوٹی اور ہندی دسویں میں۔ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ ڈرامہ آدھا ہندی اور آدھا اردو میں قلمبند کیا۔ پھر اس کمی کو پورا کرنے کے لیے جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب ماہر کا امتحان پاس کیا تا کہ اُردو سیکھنے میں التزام کا عنصر شامل رہے۔

اس کے بعد میری کہانیاں یکے بعد دیگرے مقامی اور غیر مقامی اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتی رہیں جن میں ہمدرد (سرینگر) آفتاب (سرینگر) رفتار (جموں) تعمیر (سرینگر) تعمیر ہریانہ (چنڈی گڑھ) عقاب (سرینگر) گنگ وجمن (کانپور) رگِ سنگ (کانپور) اور سینکِ سماچار دہلی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں ''ایک کہانی'' عنوان کے تحت میرا افسانہ 'ریزے' دوردرشن سرینگر سے ٹیلی وائز ہوا۔

سال بھر ہفتہ وار 'عقاب' کے ادارتی بورڈ سے بھی جنون کی حد تک وابستہ رہا اور یہ

سلسلہ ۱۹۸۳ء تک یونہی چلتا رہا۔ اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ تخلیقی طلب چاکری کی بندشوں اور آسودگی کی بے پرواہیوں کی نذر چڑھی۔ دفتری مصروفیات اور اسٹاک مارکیٹ کی تیزی مندی کے درمیان پنڈولم کی طرح جھولتا رہا۔ ذہن اور قلم دونوں پر جمود چھا گیا۔ دل میں سلگتی چنگاریاں راکھ بن کر وہیں دفن ہوتی رہیں۔ اندر کے فن کار کی موت کی تاب نہ لا کر ایک دن دیوانگی کے عالم میں تمام مسودہ جات اور چھپی ہوئی کہانیوں کو آگ میں جھونک دیا۔ بعد میں جب ہوش آیا تو کفِ افسوس ملتا رہا۔

دو تین سال پہلے زندگی نے ایسی کروٹ بدل لی کہ قلم میں پھر سے تحریک پیدا ہوئی۔ تلف شدہ افسانے (جاگو، کینچلی، ادھورے چہرے، ایک ہی خط، کالا گلاب، سلمیٰ، ریزے اور راکھ کا ڈھیر) ققنس Phoenix پرندے کی مانند یادوں کی راکھ سے دوبارہ نمودار ہوگئے۔ میں نے ان افسانوں میں اوریجنل تاثر پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے تاہم تناظر اور تجربے کے ارتقاء کی وجہ سے ممکن ہے ان میں وہ پہلی سی برجستگی نہ رہی ہو۔ 'ریزے' اور 'سلمیٰ' (خودکشی) میں تو خاصی تبدیلی آچکی ہے۔ باقی ماندہ افسانے نئے تجربات اور نئے احساسات پر مبنی ہیں۔

یہاں پر میں اپنے نظریاتی رویئے پر تھوڑی بہت روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کہانیاں اس لیے اختراع نہیں کرتا کہ کسی ادبی گروپ کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ کر اپنی پہچان بنالوں بلکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ادیب کی شخصیت آفاقی ہوتی ہے، جزئیاتی نہیں۔ قارئین کو اپنی گرفت میں لینے کی مہارت اگر اس میں موجود ہے تو وہ بنا کسی لیبل کے اپنی شناخت قائم کرسکتا ہے۔ میری کہانیوں نے گرم لاوے کی طرح مجھے مہینوں کیا برسوں اضطراب میں رکھا تب کہیں جا کر میں ان کو قارئین تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں قاری کے ذہن کے پردے پر ویسی ہی امیجز بناسکوں جیسی خود میرے ذہن کے پردے پر بنی ہوئی ہیں۔ ہاں اس میں ترسیل کی کوتاہی یا پھر تصویروں کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی دشواری کا دخل ہوسکتا ہے۔ بہر حال مجھے ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے

کہ میرے افسانوں کی رسائی زیادہ سے زیادہ قارئین تک ہو اور ان میں ایسے نکتے غور طلب ہوں جن سے نہ صرف حظ حاصل ہو بلکہ ان کے پہلو میں چھپی فکر و تردد کی چنگاریوں سے دائرہ نظر وسیع سے وسیع تر ہو۔

مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ اردو میں مغرب سے مستعار لی گئی ادبی تحریکوں کی اندھی تقلید سے جس ادبی برہمنیت (Elitism) کا جنم ہوا ہے وہ اُردو زبان کے لیے ویسے ہی نقصان دہ ہوگا جیسے قدیم زمانے میں براہمنوں نے سنسکرت کو اپنی ملکیت بنا کر عوام سے دور کر دیا۔ یہ بات صحیح ہے کہ افسانہ نگار جو کچھ لکھتا ہے وہ اس کا انفرادی تجربہ ہوتا ہے اور اس کے اندر چھپے ہوئے سمندر کے منتھن سے ہی عمدہ تخلیق ہو سکتی ہے مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس زخیرے کو باہری تجربات اور اثرات ہی جلا بخشتے ہیں۔ کہانی اس عمل اور ردعمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس میں سے اگر ایک رکن بھی غائب ہو تو کہانی کہانی نہیں رہتی۔ مجھے یہ کہنے میں بھی گریز نہیں کہ مغرب کی تقلید میں نئے نئے نظریات کو عوام پر تھوپنے کا عمل اردو میں خاص طور سے جاری وساری ہے جس کی وجہ سے ہمارا ہم عصر ادب اصل دھارے سے بچھڑ کر الگ ایک جزیرہ بن کر رہ گیا ہے۔ ہماری دھرتی پر پہلی جنگ عظیم لڑی گئی نہ دوسری۔ نہ خون ریز انقلاب آیا نہ نشاۃ الثانیہ۔ پچاس سال گزرنے کے باوجود ہماری اپنی کوئی پہچان نہ بن سکی۔ ہم نقال کے نقال ہی رہے۔ چاہے وہ ادب ہو یا فلسفہ، سائنس ہو یا ٹکنالوجی۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جب تک ہمارا ادب ہماری زندگیوں کو نہیں کھنگالتا اور ہمارے ہم عصر مسائل سے نہیں جوجھتا تب تک وہ پنپ نہیں سکتا۔ لیجئے افسانوں کا مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اب اس کو کسوٹی پر پرکھنا آپ کا کام ہے۔

دیپک بُدکی

سرینگر، کشمیر

۱۰رمئی ۱۹۹۹ء

رشتوں کا درد

اپنی بیوی کی ارتھی میں نے کئی بار اُٹھائی ہے۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ پہلی بار میں نے شادی کے چوتھے دن ہی اس کی ارتھی کو کاندھا دیا تھا۔ مرتے دم اس کی آنکھیں ایسے لگ رہی تھیں جیسے کسی خوابِ پریشان میں محو ہوں۔ میں نے بے نیازی سے اُن آنکھوں کے کواڑ بند کئے تھے۔

شمشان گھاٹ پہنچتے ہی میں نے اپنے کاندھوں کا بوجھ ہلکا کر دیا اور اس کی لاش کو جلدی جلدی چتا پر لٹا دیا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ شاید زندگی بھر لوگوں کی نندا کرتے کرتے تھک چکی تھی اور اب قوتِ گویائی بھی کھو چکی تھی۔

میں نے اپنے ہاتھ سے چِتا کو نذرِ آتش کر دیا اور خود سامنے منہ لٹکائے ہوئے پوری لاش کے بھسم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کتنا بھاری بھرکم بوجھ تھا جو میں اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔ مگر آج تو اس کی لاش بہت ہی ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔

اور پھر میں مطمئن ہو کر گھر لوٹ آیا۔

وہ تو گھر میں پہلے ہی سے موجود تھی۔ جس گھر کو میں کچھ گھنٹے پہلے عالمِ ماتم میں چھوڑ کر گیا تھا وہاں پر ہر طرف سکون چھایا ہوا تھا۔ ماحول دیکھ کر کسی پر اس بات کا شک بھی نہ گزرتا کہ اس گھر سے کبھی کوئی ارتھی اُٹھ چکی تھی۔ ہندو عورت ہونے کے ناتے وہ بار بار جنم لیتی ہے اور میرے ہی گھر میں آ ٹپکتی ہے۔ مجھے آواگون کے چکر پر اب پورا بھروسہ ہونے لگا ہے۔

آج تک اس کی موت کئی بار واقع ہوئی تھی۔ وہ مر جاتی اور میں اس کی لاش کو اپنے کاندھے پر اُٹھا کر مرگھٹ پہنچا دیتا۔ مگر وہ پھر سے زندہ ہو جاتی اور مسان کا آسیب بن کر میرا

پیچھا کرتی۔

پہلی مرتبہ جب اُس کا پنر جنم ہوا تو میرے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ اس نے میرے عقیدوں، ارادوں اور عبادتوں کا خون کیا۔ مفلسی کے بد بودار پیراہن کو اتار پھینکنے کے کوشاں تو ہم دونوں ہی تھے مگر اُس نے بہت ہی عجلت سے کام لیا۔ وہ انسانیت کے سبھی تقاضوں کو بھول گئی۔ چوہوں کی اس دوڑ میں ہم ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں منہمک ہوگئے۔ میں نے اسٹاک ایکسچینج کے انڈیکس سے اپنی ساری امیدیں اور خوشیاں وابستہ کردیں۔ کیسی مسرت ہوئی تھی مجھے جب ہرشد مہتہ کی پیٹھ پر سوار ہوکر میں آسمانوں پر اڑنے لگا تھا۔ میری اڑان میں اور کوئی شریک نہیں ہوسکا۔ میری رفیقۂ حیات بھی نہیں۔ شادی کے پھیرے لگاتے ہوئے ہم نے جو اکٹھے جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ دونوں بھول چکے تھے۔

کون کس کے لیے جیتا یا مرتا ہے؟ ہوسکتا ہے ستیہ یگ میں کوئی عورت اپنی مرضی سے ستی ہو چکی ہو مگر اب تو زمانہ ہی بدل چکا ہے۔ اور پھر ایسی تو کوئی بھی مثال نہیں ملتی جب کسی مرد نے عورت کی چتا پر چڑھ کر اپنے آپ کو شعلوں کے حوالے کردیا ہو۔

وہ حسد کی آگ میں جلنے لگی تھی یا ہوسکتا ہے کہ میں ہی اس کو دیکھ کر جل بھن چکا تھا یا پھر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں اس آگ کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ اُس نے اپنی اُڑان کی نشاندہی کی تھی۔

وہ جھوٹ، مکرو فریب اور جرائم کی بیساکھیوں کے سہارے ترقی کے ذینے طے کرتی رہی۔ ریلیف دفاتر میں کئی بے نامی کھاتے کھول کر وہ دودو ہاتھوں سے روپیہ بٹورنے لگی۔ اور اسی سرمائے سے اس نے اپنے مستقبل کی مسکان خرید لی۔ اس لوٹ میں میرے نام کو بھی گھسیٹا گیا۔ میرے اثر ورسوخ سے کھاتے کھلتے رہے اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ اب تک تو شاید میرے نام کی دھجیاں بھی اُڑ چکی ہوں گی۔

کیسی ظالم ہوتی ہے عورت کی مسکراہٹ؟ دیکھنے والے تو اپنا وجود بھی بھول جاتے

ہیں۔ پھر دستور اور قاعدے قانون کیا معنی رکھتے ہیں؟

ایک دن وہ سینہ تان کر میرے روبرو کھڑی ہوگئی اور اپنا موازنہ مجھ سے کرنے لگی۔ مجھے فزکس ٹیچر کی وہ بات اب سمجھ میں آ گئی جب وہ آئی نسٹائن کی تھیوری آف رلیٹیوٹی سمجھا رہا تھا۔

اس نے بلیک بورڈ پر ایک خط کھینچا تھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا تھا ''اس خط کے سائز کو بنا مٹائے کم کر دو''۔ میں حیرانگی سے دیکھتا رہا۔ کچھ وقفے کے بعد اُس نے خود ہی ایک اور خط پہلے والے خط کے متوازی کھینچا جو اُس سے کہیں زیادہ لمبا تھا۔ پہلا خط چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔

آج ویسا ہی خط میری بیوی میرے سامنے کھینچ چکی تھی۔

وہ میری پہنچ سے بالکل باہر چلی گئی تھی۔ اس کو پکڑنے کے لیے مجھے گردوں پر کمند ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

نظریہ اضافیت رس رس کر میرے ذہن میں اُترتا جا رہا تھا۔

آخر وہ اتنی اونچائی پر کیسے پہنچ گئی؟ زمین سے آسمان تک کا یہ سفر اس نے کیسے طے کر لیا؟ مجھے یاد ہے کہ جب وہ میری شرن میں آئی تھی تو کچھ بھی نہ تھی۔ اپنے عریاں وجود کو ڈھانپنے کے لیے اُس کے بدن کے چیتھڑے کافی نہ تھے۔ وہ اُن ہی دنوں کالج سے گریجویشن کر کے نکلی تھی اور اس کے بھائی نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے میرے سر تھوپ دیا تھا۔

میں نے خندہ پیشانی سے اس کی تقدیم کی۔ اپنا ہم دم اور ہم قدم بنایا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایسے سپنے جگائے کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ دیر رات تک اس کو داستانیں سناتا رہا۔ الف لیلیٰ کی کہانیاں، پریوں کی کہانیاں، شہزادوں کی کہانیاں، شہزادیوں کی کہانیاں، چاند تاروں کی کہانیاں۔ اس کے من میں بھی اُمنگیں جاگ اُٹھیں۔ وہ زرپری کے ساتھ آسمانوں پر اُڑنے لگی اور اپنی منزلیں تلاشتی رہی۔

میرے خواب ادھورے رہ گئے۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

نہ جانے کیوں ہم اوروں کو اپنی ناتمام خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ اپنے خواب ان میں منتقل کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ ہماری کٹھ پتلیاں بنی رہیں۔ خاص کر جب وہ ہمارے اپنے ہوں۔ اپنی بیوی، اپنے بچے، اپنے بھائی بہن ....! آخران کے بھی اپنے ارمان ہوتے ہیں۔ اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ پھر وہ ہماری کٹھ پتلیاں بننا کیوں پسند کریں گے۔ منزل کی تلاش میں کہیں نہ کہیں وہ ہمارے معین کئے ہوئے راستے سے الگ ہونے کی کوشش ضرور کرتے ہیں اور جب ہم اپنے خوابوں کے مینار گرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔

پہلی بار جب اس نے بادلوں کے ساتھ اپنی سیڑھی سٹا کر ان پر چڑھنے کی کوشش کی تھی، میں بے حد مضطرب ہوا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ گر کر اپنی ہڈی پسلی نہ توڑ دے اور پھر بے موت ماری جائے۔ مجھے اس کی ارتھی اُٹھانی پڑے گی جس کے لیے میں اس وقت قطعی تیار نہ تھا۔ میں نے سیڑھی کے ساتھ پیٹھ لگا کر اس کو سہارا دیا اور وہ ایک ایک زینہ چڑھتی گئی۔ مجھے بہت احتیاط برتنی پڑی۔ پیر پھسل جاتا تو دھڑام سے زمین پر گر جانے کا احتمال تھا۔ اور پھر اس گرنے کی ضرب بھی تو شدید اور دائمی ہوتی ہے۔ میں نے سیڑھی کا سارا بوجھ اپنے مردانہ جسم پر اٹھا لیا۔ وہ قدم بقدم چڑھتی رہی۔ میں شاباشیاں دیتا رہا۔ گاہ بہ گاہ وہ نیچے جھک کر دیکھتی اور پھر مسکرا دیتی۔ اُس کے چہرے کی تمازت کو دیکھ کر مجھے فخر محسوس ہوتا۔

جونہی وہ سیڑھی کے اوپری سرے پر پہنچی، آسمان پر تیرتا ہوا سفید بادل کا ٹکڑا اس کے قریب آ گیا۔ پورے اطمینان کے ساتھ اس نے اپنے دونوں پیر بادل کے ٹکڑے پر رکھ دیئے اور پھر اسی کے ساتھ تیرنے لگی۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ گڑبڑاہٹ میں سیڑھی میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر میرے ہی اوپر آ گری۔ میرا سارا بدن لہولہان ہو گیا۔

انسانی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔ خود غرضی اور ابن الوقتی کا مرکب! میں ہمیشہ چوکنا رہتا ہوں کیونکہ مجھے انسان کے اس گھناؤنے روپ سے سخت نفرت ہے۔ اس لیے

میں عمر بھر انسانوں کو کھر چتا رہا، کریدتا رہا۔ اُن کی ایک ایک پرت اُدھیڑتا رہا۔ اُن کی اصلیت تک پہنچتا رہا اور پھر مایوس ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ساری عمر کوئی بھی شخص میرا دوست نہ بن سکا۔

شادی کر کے میں نے بہت بڑی غلطی کر لی۔ آخر بیوی بھی تو دوست کے مانند ہی ہوتی ہے۔ جب مجھے دوستی پر ہی بھروسہ نہ تھا پھر بیوی پر کیسے رہتا۔ میں شادی کو ایک لازمی بھول چوک سمجھ بیٹھا۔

نشۂ ہستی سے آدمی کتنا مسرور ہو جاتا ہے اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میری بیوی بادلوں میں کھوگئی۔ اس کے فنا ہونے کا کچھ پتہ بھی نہ چلا۔ بس کافور ہوگئی تھی وہ۔ کوئی ارتھی اٹھی نہ چتا جلی۔ اور میں اس روز بھی اکیلا ہی گھر لوٹا تھا۔

اور پھر اس کا ایک اور جنم ہوا۔ فریڈم پارٹی کے ایک پُر اثر اور مقبول ترین نوجوان لیڈر سے اس کی اچانک ملاقات ہوگئی۔ شاید ماتر بھومی کے لیے اس کا انٹرویو لینے کے غرض سے اس کے پاس چلی گئی تھی۔ فری لانس جرنلزم اس کی ہابی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے مکھوٹے پہن رکھے تھے۔ وہ اپنے مکھوٹے کو میرے ہی وارڈ روب میں چھپا کر رکھتی تھی۔

آدرش، سماج واد اور انسانیت سے ہمدردی.......ایک صورت!

مشرقی پاکیزگی، روایت پسندی اور نیشنلزم.......دوسری صورت!

دونوں اپنے مکھوٹوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سیاسی رہنما بہت ہی متاثر ہوا۔ ایسی باوقار، بولڈ اور بیوٹی فل عورت اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ممکن ہے دیکھی بھی ہو مگر اس پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

انہوں نے آپس میں شادی کرنے کی ٹھان لی۔ راستے کی رکاوٹ صرف میں تھا اور کوئی نہیں۔

ابھے سنگھ نے اس کو بنا شادی کے اپنے پاس رکھنے کی پیش کش کی۔ وہ نہیں مانی۔ وہ باقاعدہ شادی کے بندھن میں بندھنا چاہتی تھی تاکہ اسے کوئی رکھیل نہ کہے اور اس کے بچے

حرامی نہ کہلائیں۔

ابھے سنگھ اس بات پر بھی راضی ہو گیا۔ مگر راستے کی رکاوٹ.........؟

مجھے راستے سے ہٹانے کے کئی منصوبے بنائے گئے۔

کورٹ.........!

لالچ...........!

اغوا...........!

ٹاڈا...........!

سپاری........!

ان منصوبوں میں وہ پوری طرح شریک تھی۔ لیکن میری قسمت اچھی تھی کہ میرے کانوں میں ان اسکیموں کی بھنک پڑی۔ میں نے خبر ملتے ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ آخر ابھے سنگھ سے کون بھڑ جاتا۔

وہ جا چکی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار مجھے اس کی ارتھی کو کاندھا نہیں دینا پڑا۔ میں خوش تھا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

وہ بھی خوش تھی جس کا اندازہ اس کی آنکھوں کی چمک سے لگایا جا سکتا تھا۔ وہ پھر آسمان چھونے والی تھی۔ فرط مسرت سے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ اسے یقین تھا کہ ابھے سنگھ کے ساتھ شادی کر کے اُس کی ترقی کے مزید امکانات کھل جائیں گے۔

آدمی جتنا اوپر چڑھتا ہے اتنا ہی تنہا ہو جاتا ہے اور جب چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو تن تنہا ہوتا ہے۔

اس کی تنہائی اس کو کاٹ کھا رہی تھی۔ وہ ولائتی شرابوں میں سکون ڈھونڈنے لگی مگر وہ بھی اس کی تنہائی کا مداوا نہ بن سکیں۔ اس کی شخصیت میں چڑ چڑا پن، غرور اور احساس برتری گھر کر چکے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ابھے سنگھ سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ لیکن ابھے سنگھ کی رگوں میں ٹھاکروں کا خون تھا جو اپنی ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ میری طرح کمزور براہمن نہیں تھا۔

نشے میں چورابھے سنگھ اور دیگر ساتھی رات کے اندھیرے میں اُس کو اٹھا کر لے گئے اور کیریمل ہوٹل کے باورچی خانے کے تنور میں اس کے زندہ جسم کو دہکتے شعلوں کی نذر کر دیا۔ باورچی خانہ دس منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر تھا۔ قیاس یہی تھا کہ جل کر راکھ ہو جائے گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

مگر اس روز ہواؤں کا رُخ کچھ اُلٹا رہا۔ اوپر اڑنے کے بجائے دھواں زمین کو تلاشنے لگا۔ سب کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ جلتی رہی اور جلتے بدن کی بدبو وردی پوشوں کے نتھنوں میں سوراخ کرنے لگی۔

دوسری صبح جلے ہوئے بدن کا کوئلہ اخباروں کی سرخیوں میں تبدیل ہو گیا۔ یہ اس کی آخری موت تھی۔ اس بار میں اُس کے لاشے کو اپنے کندھے پر نہیں اُٹھا سکا۔ وہ ہمیشہ چاہتی تھی کہ اس کا نام کسی نہ کسی بہانے روشن ہو۔ ہر جگہ اس کا چرچا ہو۔ آخر کار وہ اپنی جان دے کر اخباروں کی سرخیوں میں امر ہو گئی۔

ابھے سنگھ نے اپنے آپ کو نردوش ثابت کر دیا۔ انگشتِ جرم میری طرف اٹھائی گئی اور میری کسی نے بھی نہ سنی۔ اب میں مقررہ گھڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔

جیل کی یہ کوٹھری بہت ہی آرام دہ ہے۔

☆☆☆

جاگو

جاگو! جاگو!! نیند سے جاگو۔ طلسمِ خواب سے جاگو۔ پو پھٹ چکی ہے۔ ظلمت شب کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ سوئے اُفق دیکھو۔ خورشید کا بے لگام گھوڑا ایک نئے سفر کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔

جھوٹ! جھوٹ!! سراسر جھوٹ!!! ابھی سویرا نہیں ہوا۔ ابھی رات باقی ہے۔ کالی اننت رات۔ لیٹے رہو۔ سوتے رہو۔ آج سویرا نہیں ہوگا۔ چار سو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ دِس از بی بی سی ورلڈ سروس۔ اینڈ آئی ایم موسیٰ اسپیکنگ فرام دی ماونٹ آف ڈارکنس۔ یہ اندھیر نگری ہے۔ یہاں کا حاکم چوپٹ راجہ ہے۔ کہیں بھول سے بھی کوئی سچی بات زبان پر نہیں لانا۔ تمہارا سر قلم ہوگا۔ تمہاری زبان جڑ سے اُکھاڑ دی جائے گی۔ تمہاری آواز پر پہرے لگا دیئے جائیں گے۔ خبردار! ہوشیار!!

یہ کوہ طور کا ٹرانسمشن ٹاور ہے۔ خدا کے ساتھ میرا لِنک پھر سے بحال ہو چکا ہے۔ اور میں نے خدا سے سوال پوچھا۔

''تم نے یہ دنیا کیوں تخلیق کی؟''

خدا پشیمانی سے سر جھکائے مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے کئے پر بہت پچھتا رہا ہے۔ اُسے کوئی بھی جواب نہیں سوجھتا۔ میں کب سے جواب کا منتظر ہوں۔ مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے اُس نے بارہا کوہ پر دہشت ناک بجلیاں گرائیں مگر پھر بھی میری زبان بند نہ ہوئی۔ میری سوچ اور فکر میرے وجود کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہ انہیں الگ نہیں کرسکتا۔ میرا سوال

---

* یہ کہانی پہلی بار ایمرجنسی کے دوران ماہنامہ 'تعمیر' سرینگر میں چھپی تھی۔

اب بھی ہواؤں میں گشت کرر ہا ہے۔ اور خدا اب بھی پشیمان ہے۔

تم ابھی تک جاگے نہیں، ساری دنیا جاگ چکی ہے اور تم سو رہے ہو۔

اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی اب رین کہاں جو سووت ہے

جو سووت ہے وہ کھووت ہے جو جاگت ہے وہ پاوت ہے

دیکھتے نہیں ہر طرف اُجالا ہی اُجالا ہے۔ سبھی بستیاں جاگ اُٹھی ہیں۔ وہ سنو مندروں کی گھنٹیاں، مسجدوں کی اذانیں، کلیساؤں کی دعائیں، گورودواروں کے شبد کیرتن۔ کیا تمہارے کانوں تک لاوڈ اسپیکروں کی آوازیں نہیں پہنچ رہی ہیں؟ لو، غور سے سنو۔ وہ آوازیں آپس میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔

اوم نمے شوائے، اوم نمے شوائے......!

اللہ اکبر، اللہ اکبر........!

اوہ گاڈ، دی فادر آف ہیون۔ ہیو مَرسی آن اَس...!

جو بولے سو نہال، ست سری اکال.........!

مندروں، مسجدوں، گرجوں اور گورودواروں کی یہ آوازیں بلند سے بلند تر ہو رہی ہیں۔ بھگوان، اللہ، گاڈ، واہگورو۔ ایک دوسرے سے سبقت لینا چاہتے ہیں۔ اور تم! تم پھر بھی سو رہے ہو۔ بھگوان جاگ اُٹھا ہے۔ خدا جاگ اُٹھا ہے۔ گاڈ جاگ اُٹھا ہے۔ رب جاگ اُٹھا ہے۔ آدم نے ان کو جھنجھوڑا ہے۔ اور خود سو رہا ہے۔ اُٹھو جلدی کرو۔ مندروں کی طرف دوڑو۔ مسجدوں کی طرف دوڑو۔ گرجوں کی طرف دوڑو۔ گورودواروں کی طرف دوڑو۔ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ان پرستش گاہوں کی طرف رجوع کرو۔ تم نے جتنے بھی گناہ کئے ہیں اُن تمام گناہوں سے توبہ کرو۔ بھگوان کرپالو ہے۔ اللہ رحیم ہے۔ گاڈ از مرسی فل۔ رب دیالو ہے۔ وہ منکسر آدم کی پردہ پوشی کرے گا۔ وہ تم کو معاف کرے گا۔ تمہارے کردہ گناہوں کو تمہارے اعمال نامے سے مٹا دے گا۔ تمہاری کرنی کا سلیٹ صاف کر دے گا۔

جاؤ، اب تم آزاد ہو۔ تمہاری سلیٹ صاف ہو چکی ہے۔ اب تم پھر گناہ کر سکتے ہو۔ ابھی تک زمین پر گناہوں کا بوجھ اتنا نہیں ہوا کہ نوحؑ کا سیلاب آجائے۔ یا کوئی اکال پڑ جائے۔ یا پھر کوئی طاعون پھیل جائے۔ ابھی تم جی بھر کر گناہ کر سکتے ہو۔ تمہیں گناہ کرنے کی کھلی چھوٹ ہے۔ ابھی روزِ قیامت بہت دور ہے۔ اب کوئی بھی پیغمبر تمہیں ٹوکنے کے لیے روز قیامت تک نہیں آئے گا۔

لاوڈ اسپیکروں کی وہ آوازیں!

اور مشینوں کی یہ سیٹیاں!!

دونوں بنی نوع انسان کو بلا رہی ہیں۔ چار سو بھوک مری کا عالم ہے۔ پیٹ کی بھوک، جسم کی بھوک، روح کی بھوک۔

بچو، تم بھی اُٹھو! اسکولوں کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اپنے اپنے بستے اُٹھاؤ اور دوڑو۔ اپنے اسکولوں کی جانب دوڑو۔ وہاں قطاروں میں کھڑے ہو کر اقبال کا قومی ترانہ گاؤ۔

'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'

ترانہ گاتے وقت اپنے ماحول اور اپنی بستی کو بھول جاؤ۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ 'میرا بھارت مہان' ہے۔ چپ ہنسومت، ہنسا منع ہے۔ قومی ترانہ گاتے وقت ہنسنا قطعی منع ہے۔ مجھے نہیں معلوم اقبال ایسی نظم تخلیق کر کے پھر اپنے ہی ملک سے بے زار کیوں ہوا تھا۔

بچو! تواریخ کی کتابیں کھولو۔ دنیا کے بے شمار کتب خانے آدم کی تواریخ سے بھرے پڑے ہیں۔ کاغذ کی یہ اَن گنت الماریاں۔ آدم کے کرتوتوں کا پُلندا۔ خونیں قصے! طلسمی کہانیاں! کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ وار ڈرامہ......اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے آدم! دیکھو، کتنے رول نبھائے ہیں اس آدم نے۔ کس تندہی سے اس نے ہر کردار میں جان ڈال دی ہے۔ کبھی فرعون اور کبھی موسیٰ! کبھی نمرود اور کبھی عیسیٰ! کبھی ہٹلر اور کبھی گاندھی! کبھی پتلی بائی اور کبھی مدر ٹریسا! آدم نے ہر کردار بڑی خوبی سے نبھایا۔ اسی لیے اس کو 'اشرف

المخلوقات' کا خطاب ملا۔

ٹرن، ٹرن، ٹرن۔ پردے گرادو۔ روشنیاں گل کردو۔ سین بدل دو۔ یہ میرا حکم ہے۔

لو اسٹیج پر اندھیرا چھا گیا۔ پردے کے پیچھے آدم اپنے چہرے پر چنگیز خان کا مکھوٹا چڑھا رہا ہے۔ وہ ایک اور چنگیز خان کا رول ادا کرنے کے لیے آتش زیرپا ہے۔ سامنے بیٹھی اذیت پسند جنتا بے صبری سے اُس کا انتظار کر رہی ہے۔

دِی ورلڈ آف ڈارکنس! بلیک آوٹ!! دِس از وائس آف امریکا! اور میں نے خدا سے ایک اور سوال کیا۔

''تم نے آدم کو باغِ بہشت سے کیوں نکالا؟''

خدا مغموم ہے۔ وہ اب بھی پچھتا رہا ہے۔ وہ میری طرف نظریں اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں۔ وہ پھر مجھے ڈرانا چاہتا ہے۔ دھمکانا چاہتا ہے۔ پھر کوہ کی اوٹ سے دہشت ناک بجلیاں کوندنے لگی ہیں۔ میں خوف زدہ ہو کر اپنی غار کے اندر دھنستا چلا جا رہا ہوں۔

اے آدم زاد......! کیا تم نے سورج سے کبھی مظالم کی کہانیاں سنی ہیں؟ کائنات کا سب سے بڑا چشم دید گواہ بس وہی ہے۔ وہ تب سے گردش میں ہے جب سے یہ کائنات بنی ہے۔ اُسے سب کچھ معلوم ہے۔ لیکن وہ بتاتا نہیں۔ اے دھرتی کو روشن کرنے والے سورج! تم بولتے کیوں نہیں؟ جب بے بس دروپدی کا چیر ہرن ہو رہا تھا، بھیشم پتاما بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیا تم نے وہ منظر نہیں دیکھا؟ جب اکلویہ کا انگوٹھا قلم ہوا، ستیہ وادی یدھشٹر نے اُف تک نہیں کی۔ کیا تم نے وہ منظر بھی نہیں دیکھا؟ جب عیسیٰؑ اپنے نحیف کاندھے پر وزنی صلیب اُٹھائے لہولہان ہو رہا تھا، اہل اسرائیل نے دیکھ کر بھی ان دیکھی کرلی۔ اے خورشید عالم، کیا تم اس کے ضامن نہیں تھے؟ جب حسینؓ صحرائے کربلا کی پیاس اپنے معصوم لہو سے بجھا رہا تھا، اہل اسلام تماشائی بنے بیٹھے رہے۔ کیا تم اس کے ضامن نہیں تھے؟

اے آدم زاد! کیا تم نے کبھی گنگا کی پاک لہروں سے پوچھا ہے، نیل کے شفاف پانیوں سے پوچھا ہے، یا پھر دجلہ وفرات سے پوچھا ہے کہ ان کے کناروں پر آدم نے جو بستیاں بسائیں، جو تہذیبیں آباد کیں، ان سب کا کیا حشر ہوا؟ وہ کیوں اُجڑ گئیں؟ اُن کو کس نے اُجاڑ دیا؟ کیا ان سب کو نیست ونابود کرنے والا خود آدم نہیں تھا؟ پھر کیوں وہی آدم آج کدالیں اور پھاوڑے لے کر ان کی بازیافت میں سرگرداں ہے؟ کیوں وہ ان کڑیوں کو ملانے کی کوشش کر رہا ہے جن کڑیوں کے نقش اس نے خود ہی صفحہ ہستی سے مٹا دیئے۔ وہ کیوں اتنی کڑی محنت اور لگن سے زمین کے بطن سے فوسل برآمد کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟ کیا لوحِ ہستی پر اتنا لکھنا کافی نہیں کہ یہ سب آدم کے کارنامے ہیں۔ یہ ان گنت دیار آدم نے خود ہی اجاڑ دیئے۔ یہ ایٹم بم آدم نے ہروشما اور ناگاساکی پر پھینکے۔

دیکھو یہ گنگا میا ہے نا! کب سے بہتی چلی جا رہی ہے۔ کب سے یہ مظلوم عصمت باختہ عورتوں کو شرن دیتی رہی ہے۔ اُن عورتوں کو جنہیں اپنے ہی پاسبانوں نے لوٹا ہے۔ ان کی سسکیاں ابھی تک صدائے بازگشت بنی ہوئی ہیں۔ بوڑھے آدم کی استیاں اسی گنگا کے سپرد کی گئی تھیں تا کہ محفوظ رہیں۔ یہ گنگا ہماری تہذیبوں کی سب سے بڑی سند ہے۔ اس گنگا میا کی پرستش کرو۔ اس کے پانی میں ہر پورنماشی کے دن اشنان کر لو۔ اپنے من کا میل دھو لو۔ اس گنگا میں کتنی عمق ہے۔ یہ ہماری تہذیبوں کا میل اپنے اندر سماتی چلی جا رہی ہے۔

اور وہ دیکھو دُرگا کی تصویر! ملک کے مشہور مصور ایم ایف حُسین نے تخلیق کی ہے۔ دیکھتے نہیں اس کے ہاتھوں میں وہ برچھے، وہ بھالے، وہ خنجر، وہ ترشول، ہم نے اُس کو اپنی حفاظت کے لیے چنا ہے۔ اس کی آواز سنو! وہ غربت وافلاس کی بیخ کنی کرنے نکل پڑی ہے۔ وہ ہر چشم پرنم سے آنسو پونچھنے نکل پڑی ہے۔ وہ ہر چہرے پر تبسم بکھیرنے چلی ہے۔ وہ ظالموں کا سمہار کرنے نکل پڑی ہے۔ وہ ہماری محافظ ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کرو...... یہ مت بھولو کہ اس کے ہاتھوں میں برچھے ہیں، بھالے ہیں، خنجر ہیں، ترشول ہیں، وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اسی کے حکم سے روشنیاں گل کروا دی گئی ہیں۔

پردے کے پیچھے اداکاروں نے بغاوت کی ہے۔ وہ انقلاب کی باتیں کررہے ہیں۔ وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ اسٹیج پر اندھیرا ہوچکا ہے۔ درگا اس وقت اسٹیج پر معجزہ دکھانے کے لیے بےتاب ہے۔ وہ اسٹیج پر سینہ بہ سپر ہے۔ وہ ضرور کچھ کر دکھائے گی۔

ہوشیار! یہ کون گستاخ ہے جس نے اسٹیج پر اچانک روشنی کردی ہے جب کہ درگا کا معجزہ ابھی نامکمل ہے۔ اسٹیج کی ہر شے دکھائی دے رہی ہے۔ سب کچھ عیاں ہوچکا ہے۔ ناظرین واویلا مچارہے ہیں۔ ''خون.....خون......حق کا خون ہوا...... باطل بچ نکلا.......!''

اسٹیج کے کارندے گھبرائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے روشنیاں گل کردی ہیں۔ پردے گرادیئے ہیں۔ سین ختم ہوچکا ہے۔ پردے کے پیچھے نئے سین کی تیاریاں شروع ہورہی ہیں۔ ہر سازش کا پلان پردے کے پیچھے ہی ہوتا رہا ہے۔

''روشنی......! اندھیرا......سائیڈ لائٹس......! پردہ اُٹھادو! نہیں، پردہ گرادو! رُکاوٹ کے لیے کھید ہے۔ اور میں نے ایک بار پھر خدا سے سوال کیا۔

''اے خدا! وہ تمہارے روزِ قیامت کا کیا ہوا؟''

خدا حیرانگی کے عالم میں مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنی گھڑی کی سوئیوں پر نظر ڈالی۔ اس کی گھڑی کب کی بند ہوچکی ہے۔ وقت تھم چکا ہے۔ اضطراب میں وہ میرے سوال کا جواب نہیں دے پارہا ہے۔ وہ حیران ہے کہ اتنی بجلیاں کڑکنے کے باوجود بھی میری زبان نہیں رُکی۔ لو اس نے فرمان جاری کردیا۔

''اے عزرائیل، اس سرکش بندے کو واپس بلالو۔ ورنہ یہ زمین پر بدامنی پھیلائے گا''۔

لو، میں واپس جارہا ہوں۔ ٹو دی گارڈن آف ایڈن۔



بٹی ہوئی عورت

لاجونتی کو گھر لاکر شیکھر نے سبھی رشتے داروں کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ پتاجی کب سے اس بات کی آس لگائے بیٹھے تھے کہ بیٹا جونہی سول سروسز جائن کرے گا اس کی شادی کسی کمشنر یا سیکریٹری کی بیٹی سے کردیں گے جس سے نہ صرف شیکھر بلکہ سارے کنبے کی پراگندہ حالت سنور جائے گی۔ عموماً بڑے گھر کی بیٹیوں سے خوش گفتاری، خوش خلقی اور خوش انتظامی کی امید کی جاتی ہے۔ ایسے رشتے آفیشل کیریئر میں بھی معاون بن جاتے ہیں۔ باقی جو اُوپر والے کی مرضی۔

بچپن ہی میں شیکھر کے سر سے ماں کا سایہ اُٹھ چکا تھا۔ اُس کا خوشحال گھر منتشر ہو چکا تھا اور اب کسی مہذب، سگھڑ اور بامروّت لڑکی کی آمد کا متمنی تھا۔

اُدھر بھائی بہنوں پر یہ دُھن سوار تھی کہ کب اس کی شادی ہو اور گھر کی مالی حالت سدھر جائے۔ انہیں بھروسا تھا کہ بھابی اللہ دین کا چراغ لے کر ضرور آئے گی۔

ایک متوسط گھرانے کے ٹوٹے پھوٹے خواب.....!

نودولتئے رشتہ داروں نے تو حد ہی کردی۔ انہوں نے سپنوں میں اپنی بیٹیوں کو شیکھر کی سیج سجاتے ہوئے بھی دیکھا۔ شیکھر جب بھی اپنی موسی یا پھوپھی کے گھر جاتا تو اُس کا استقبال ایک ہی فقرے سے ہوتا۔

''بیٹے، بس امتحان پاس کر کے ایک بار نوکری پر لگ جاؤ، تمہارے لیے چاندسی دلہن ڈھونڈ رکھی ہے۔''

شیکھر تھا کہ بغاوت کی دَرپے تھا۔ اُس نے ایک غریب نادار لڑکی کو اپنی رفیقہ ٔ

حیات بنانے کا فیصلہ کیا۔ نام تھا لاجونتی۔ کم سنی میں ہی اُس کا باپ بھگوان کو پیارا ہو چکا تھا۔ گھر میں ایک بھائی تھا اور چار بہنیں۔ سبھی اپنی اپنی فکر میں لگے رہتے۔ اب تو دو بہنوں کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ صرف ماں تھی جو ڈھال بن کر اُس کو دنیا کے نرم و گرم سے بچانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ شیکھر کا خیال تھا کہ غربت و افلاس میں پلی ہوئی لاجونتی زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے واقف ہوگی۔ اُس کا مشاہدہ عمیق ہوگا اور وہ پیار اور اخلاص کی دیوی ہوگی۔

لاجونتی میں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اُس گنجی کبوتری کی مانند تھی جو محلوں میں ڈیرا ڈال چکی ہو۔ شیکھر کا منطق غلط ثابت ہوا۔ اتنا ہی نہیں وہ اپنے ساتھ اپنا ماضی بھی سمیٹ کر لائی تھی۔ کم سنی میں اُس پر ہوئی دست درازیوں نے اُس کے ذہن پر ایسے گہرے گھاؤ چھوڑ دیئے تھے جو کبھی ہسٹیریا کی شکل میں نمودار ہوتے اور کبھی سکیزوفرینیا کی حدوں کو چھو جاتے۔

بھائی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے چودہ سال کی عمر میں ہی لاجونتی کو اُس کی سب سے بڑی بہن نے اپنے پاس بلا لیا۔ بالکل نیا شہر تھا۔ اسکول میں داخلہ کرایا گیا۔ ہر صبح لاجو سفید چولی اور نیلا اسکرٹ پہنے اپنا بستہ کاندھے پر لٹکائے ہوئے اسکول جانے لگی۔ گھڑی کی ٹک ٹک چڑھتی جوانی کا الارم بن گئی۔ ادھر رنگت کھل اُٹھی، اُدھر خرام میں لچک پیدا ہوگئی۔ آنکھیں بھی چمکنے لگیں۔ اور امبیا جیسی چھاتیاں بھی پھولنے لگیں۔ شروع شروع میں خالی چولی سے ہی کام چل جاتا تھا مگر جوں ہی بھاری لٹکتی ہوئی گھنٹیوں کے جھولنے کا احساس ہوا تو انہیں انگیا کے کٹوروں میں سمیٹ لینا پڑا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ انگیا میں چھاتیاں مزید نمایاں ہوگئیں۔

شفقت پدری کی تلاش میں بھٹکتی لاجو بارہا اپنے جیجا کے سامنے بیٹھ کر اپنا سبق دُہراتی یا اُس کے ساتھ شطرنج کھیلتی یا پھر اُس کی گود میں اپنا سر رکھ کر ایلسِ Alice کے ونڈرلینڈ میں کھو جاتی۔ جیجا لاجو کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتا یا پھر اُس کے نرم و گداز گالوں کو پچکارتا۔ اس کی نیت میں کبھی کوئی بے ایمانی کا ارادہ نہیں تھا تاہم اُس نسوانی

لمس سے اُس کی آنکھوں میں خوذگی چھا جاتی۔ لاجو بھی نادانی کی وجہ سے اس لطیف احساس سے لذت یاب ہونے کی ٹوہ میں لگی رہتی۔ اور ایک روز بیوی کی غیر موجودگی نے جذبات کو تعقل پر غالب کر ہی دیا۔ دریا اپنے کنارے توڑ کر سرکش ہوگیا۔ لاجو کو جب ہوش آیا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔

اُس حادثہ کے بعد لاجو اپنے آپ سے شدید نفرت کرنے لگی۔ وہ ہر دم کھوئی کھوئی رہتی۔ انجام کے تصور ہی سے خوفزدہ ہو جاتی۔ ساری رات خوفناک سپنے آتے رہتے۔ کوئی جلاد گنڈاسا لے کر اُس کا پیچھا کرتا۔ وہ اندھیرے جنگلوں میں اُس سے پیچھا چھڑانے کے لیے دوڑتی، بھاگتی، چیختی، چلاتی مگر مدد کے لیے کوئی نہیں آتا۔ وہ چہرہ جانا پہنچانا سا لگتا۔ تبھی آنکھ کھلتی اور وہ اس چہرے کی شناخت کرنے کی کوشش کرتی مگر ناکام رہتی۔ بہن سے کہنے میں ڈر لگتا تھا۔ اس لیے اپنی ہی حرارت میں جلتی رہتی۔ حالانکہ اس میں اس کا کوئی دوش نہیں تھا۔ جب محافظ ہی غارت گری پر اُتر آئے تو ننھی معصوم بچی کیا کرسکتی تھی۔

اس کے باوجود لاجو کو بار بار موقع بے موقع اُسی دلدل میں کودنے کی شدید خواہش ہوتی۔ ڈر اور خواہش چور سپاہی کا کھیل کھیلتے۔ کئی مہینوں کے بعد جب اس کی بہن کو اتفاقاً اس آشنائی پر شک ہوا تو اُس نے لاجو کو واپس اپنے گھر بھیج دیا۔

اُس معصوم چھوئی موئی کی روح زخمی ہوچکی تھی۔ دنیا میں ہر مرد اُس کو بھوکا اور خونخوار نظر آنے لگا۔ مگر پھر بھی منہ میں خون لگی شیرنی کی مانند اس کو مردوں کی مسلسل خواہش ستاتی رہتی۔ کالج میں دو ہی برسوں کے اندر اس نے نصف درجن معاشقے سر کر لیے۔ لیکن جب یار دوستوں نے گھر کے دروازے پر دستک دینی شروع کردی تو پھر سے شہر بدر ہونے کا حکم نازل ہوا۔ اس بار وہ ماں کے ہمراہ اپنے آبائی شہر چلی گئی جہاں اس کی اپنی ذات برادری کے لوگ رہتے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں لاجونتی کی قسمت نے اچانک کروٹ لی۔ شیکھر نے اُس کو پسند کرلیا۔ لاجونتی نے کبھی خواب وخیال میں بھی نہ سوچا تھا کہ اُس کو ایسا ہمسفر مل جائے گا اور وہ بھی کسی مول تول کے بغیر۔ وہ اپنے جامے میں پھولی نہ سمائی۔

کہتے ہیں چاموں کا مارا چولہا نہیں پنپتا۔ سہاگ رات ہی میں شکوک وشبہات نے شیکھر کے دل میں گھر کرلیا۔ پھولوں کی سیج کانٹوں بھری لگنے لگی۔ بکارت کے سوال نے اپنا سر اٹھالیا۔ لاجونتی کے کیژول رویئے نے شبہ کو پختگی بخشی۔ شیکھر نے درگزر کرنے کی بہت کوشش کی مگر تحت الشعور میں انگارے سلگتے رہے۔ وہ کس کو دوشی ٹھہراتا۔ شادی کے لیے اس نے خود ہی سب کی مرضی کے خلاف ہاں کی تھی۔ زہر کا گھونٹ پی کر اُس نے حالات سے سمجھوتہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔

ہرچند لاجونتی اپنے ماضی کو بھلانا چاہتی تھی مگر اُس کے دل کا کرب اُس کے وجود کو دن رات جھنجھوڑتا رہا۔ شیکھر نے اُس کے ماضی کو کریدنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی۔ البتہ لاجونتی خود ہی اپنے گناہوں کے بوجھ تلے دب رہی تھی۔ بارہا اُس کے دماغ میں آیا کہ جاکر شیکھر کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرے اور جو بھی سزا وہ دے اُسے ہنسی خوشی قبول کرلے۔ یوں اس کے دل کا میل بھی دُھل جاتا اور شاید شیکھر بھی چین کا سانس لے پاتا لیکن ماں کی ہدایت مانع ہوتی۔

''لاجو، تمہاری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ تم سب کچھ جاکر شیکھر کو بتاتی ہو۔ مرد کو سچی بات بتانا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے برابر ہے۔''

وہ پھر سنبھل جاتی اور اٹھائے ہوئے قدموں کو روک لیتی۔ اس عدم استحکام کو دور کرنے کے لیے لاجونتی نے اپنے دلکش جسم کا بھرپور استحصال کیا۔ اُسے یہ گماں تھا کہ عورت شیکھر کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ ہر روز اپنے آپ کو نئے نئے روپ میں شیکھر کے سامنے پیش کرنے لگی۔ نئے نئے لباس، طرح طرح کے میک اپ۔ وہ شیکھر کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی بانہوں کی گرفت شیکھر کے اردگرد مضبوط سے مضبوط تر کرتی گئی۔ اُس نے شیکھر کے ہر قدم پر پہرے بٹھادیئے اور اُس کی سوشل لائف کی لگام اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ وہ چاہتی تھی کہ شیکھر اُس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنا رہے اور جہاں بھی جائے اُسی کے بدن کی مہک ڈھونڈتا پھرے۔

یہ شاید اُس کے زخمی وجود کا طریقہ انتقام تھا۔ مرد ذات سے انتقام۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کرتا کوئی ہے اور بھرتا کوئی ہے۔ لاجونتی شکنجہ کستی رہی اور شیکھر چھٹپٹاتا رہا۔

آخر کارتنی ہوئی رسی ٹوٹ گئی۔ شیکھر نے اپنے قریبی دوست سے صلاح مشورہ کیا۔

''تم طلاق کیوں نہیں لیتے؟'' دوست نے پوچھا۔

''طلاق......!'' شیکھر کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ ''طلاق اور اس عمر میں.....! اتنے سالوں بعد........!

''کیوں نہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے نہیں ہو۔ تمہاری نگاہیں ہمیشہ لذتِ نفسی کی خاطر گھر کی چوکھٹ کے باہر جمی رہتی ہیں۔ بھابی کا تو خدا جانے۔ بچوں کو بھی تم لوگوں نے فراموش کر دیا ہے۔ کبھی سوچا بھی ہے کہ اس روز کی جھک جھک سے ان پر کیا اثر پڑتا ہوگا۔ وہ تو نروس ریک بن چکے ہوں گے''۔

''تو میں کیا کروں۔ وہ پڑھی لکھی عورت ہے۔ بھلے بُرے کی تمیز کر سکتی ہے۔ میں نے سوچا تھا معاملے کی نزاکت کو سمجھ کر خود ہی طلاق کے لیے رضامند ہوگی۔ وہ ہے کہ جونک کی طرح لپٹی ہوئی ہے۔''

''تم خود ہی طلاق کے لیے درخواست کیوں نہیں دیتے۔ یوں بھی ہمارے ملک میں عورتیں طلاق دینے میں پہل نہیں کرتیں۔ ایک شوہر کو چھوڑ کر دوسرے کی گود میں آسرا لینے کا چلن ابھی متوسط طبقے میں عام نہیں ہے۔ ان کو ڈر لگتا ہے کہ سماج خاص کر ان کے سگے والے اُن سے ترک تعلق نہ کریں۔ تب وہ تنہا پڑ جائیں گی۔ وہ پہلے ہی سے غیر محفوظیت کے سبب خوف زدہ ہوتی ہیں۔''

''میں نے اس بارے میں بہت سوچ بچار کیا۔ بدقسمتی سے اس دیش کا قانون ہی کچھ ایسا ہے کہ کورٹ کچہری کا دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے دس بار سوچنا پڑتا ہے۔ طلاق ملتے ملتے سالوں بیت جاتے ہیں۔ تب تک سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔ اور پھر طلاق کی شرائط بھی تو محدود ہیں۔ ذہنی اَن میل کی بنا پر طلاق ملنے سے رہا۔ چاہے اونٹ کے گلے میں بلی ہی

کیوں نہ بندھی ہو۔طلاق لینے کے لیے مجھے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ لاجونتی بد چلن اور بدکار ہے۔ جھوٹی گواہیاں اور جھوٹے ثبوت پیش کرنے پڑیں گے۔ کچہری میں اس کی مٹی پلید کرنی پڑے گی۔تم تو جانتے ہو کہ یہ سب میری فطرت میں نہیں ہے۔ یہ کورٹ کچہری والے کیوں نہیں سمجھتے کہ ذہنی طور پر دو بے جوڑ انسان اپنی مرضی کے خلاف کیسے نباہ کر سکتے ہیں۔اس سے بدنام بازاروں کو تقویت پہنچتی ہے۔ بال بچے نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جنسی بھوک سے تڑپتے یہ مرد و زن کمسن بچوں اور بچیوں کے ساتھ بدفعلیاں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر کئی لاجونتیاں پیدا ہوتی ہیں اور کمسنی میں ہی مرجھا جاتی ہیں''

''شیکھر، تم بھابی کو طلاق دینے کے لیے راضی کیوں نہیں کرتے۔اس کے ساتھ بیٹھ کر بات تو کرلو''۔

''یہی تو رونا ہے میری زندگی کا۔لاجونتی طلاق کیوں دے گی؟ اُس کو نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ میسر ہے جس کا اُسے وہم وگماں ہی نہ تھا۔اتنے بڑے افسر کی بیوی۔ یہ جاہ وحشمت۔نوکر چاکر، مکان، گاڑی۔کیا کچھ نہیں ہے اُس کے پاس۔جن رشتے داروں کے سامنے آج وہ فخر سے اپنا سر اونچا کر کے اپنی قابلیت اور ذہانت کی ڈھینگیں مارتی ہے انہی کے پاس کل وہ کونسا منہ لے کر چلی جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے طلاق دینے سے کتراتی ہے۔''

''یہ معاملہ تو بہت پیچیدہ لگتا ہے بھائی۔ نہ نگلتے بنتی ہے نہ اُگلتے۔خیر میری تو پھر بھی یہی صلاح ہے کہ کورٹ میں درخواست داخل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔''

''بات تو صحیح ہے اگر پانچ دس سال لگ بھی گئے اس عمر قید سے تو چھٹکارا مل سکتا ہے۔''

شیکھر اپنے دل کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو گیا۔

اُن ہی دنوں شیکھر کا تبادلہ پٹنہ ہو گیا۔ وہ لاجونتی کو اکیلے چھوڑ کر بچوں کے ہمراہ پٹنہ چلا گیا۔لاجونتی لکشمی ودیا مندر میں لکچرار تھی۔شادی کے بعد اُس نے خوب ڈگریاں حاصل

کی تھیں مگر گھر میں اب وہ پہلی سی رونق نہیں تھی۔ سارا گھر سونا سونا سا لگتا تھا۔ مکان کی دیواریں کاٹنے کو دوڑتی تھیں۔ اس اکیلے پن سے وہ دھیرے دھیرے اُکتا گئی اور پھر ہندی شعبے کے ہیڈ وجے کمار کے شرن میں چلی گئی۔ وجے کمار لاجونتی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ پینتیس کی عمر پار کرنے کے باوجود شادی کے اہم فیصلے کو ٹالتا رہا تھا۔ اب جو اپنی کرٹ بڑی ڈاڑھی پر نظر پڑی تھی تو گھبرا اُٹھا۔

وجے کمار اور لاجونتی کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ ایک ہی جیسا تھا۔ قدریں ایک جیسی تھیں۔ نظریات ایک جیسے تھے۔ یہاں تک کہ منہ کا ذائقہ بھی ایک جیسا تھا۔ آدھی چھٹی کے دوران لاجونتی ابھی اپنے لنچ کا ڈبہ کھول ہی رہی ہوتی کہ وجے کمار اُس پر جھپٹ پڑتا۔

''تم بہت اچھا کھانا بنا لیتی ہو۔ کہاں سے سیکھ لیا ہے یہ ہنر؟'' ایک روز وجے کمار پوچھ بیٹھا۔

لاجونتی اپنی تعریف سن کر جھوم اُٹھی۔ اپنے شوہر سے تعریف کے دو بول سننے کے لیے اُس کے کان ترس گئے تھے۔ شوہر نہ سہی کسی نے تو سراہا تھا اُس کی محنت کو۔ جی میں آیا کہ ان ہونٹوں کو چوم لے جن سے یہ الفاظ نکل پڑے تھے۔

''اپنی ماں سے۔ اور کہاں سے سیکھتی'' اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں وجے کمار کی آنکھوں میں کچھ ٹٹول رہی تھیں۔

''اس چھوٹے سے ٹفن سے پیٹ نہیں بھرتا۔ کبھی پیٹ بھر دعوت کھلاؤ تو بات بنے'' وجے کمار نے لاجونتی کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''کیوں نہیں۔ آنے والے اتوار کو میرے ساتھ ہی ڈنر کیجئے''۔ لاجونتی کو معلوم تھا کہ مرد کا دل پیٹ کے راستے ہی سے جیتا جا سکتا ہے۔

''ارے نہیں میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا''۔

''مگر میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ میں سنڈے کو ڈنر پر آپ کا انتظار کروں گی''۔

وجے کمار نے اُسی دم گرہ باندھ کر رکھ دی اور اگلے اتوار کو جھٹپٹے کے وقت لاجونتی کے گھر پہنچ گیا۔

پھر آنا جانا معمول سا بن گیا۔ جب بھی وجے کمار کے آنے کی امید ہوتی لاجونتی پہلے ہی سے کچن میں گھس کر لذیذ ضیافتیں تیار کر کے رکھ دیتی۔ وجے کمار نہ صرف کھانے میں بلکہ لاجونتی کے ہر کام میں دلچسپی لینے لگا۔ اُس کی تعریفوں کے پل باندھنے لگا۔ لاجونتی میں اُسے ایک آئیڈیل بیوی کا روپ نظر آنے لگا۔ اُس کی قربت نے ساری دنیا بھلا دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی گرل فرینڈ ارچنا کو بھی بھول گیا جس کے ساتھ کئی سالوں سے اس کا معاشقہ چل رہا تھا۔ وجے کمار ارچنا کو اپنی زندگی سے کینچلی کی طرح اُتار پھینکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اب اس کی زندگی کا واحد مقصد لاجونتی کو حاصل کرنا تھا اور کچھ بھی نہیں۔

اس کے برعکس لاجونتی چل رہے بندوبست سے مطمئن تھی۔ زندگی کے اس بٹوارے سے اُس کی شخصیت کے ہر پہلو کی آبیاری ہو رہی تھی۔ راحت، آرام، آسائش اور سماجی رتبہ مہیا کرنے کے لیے شیکھر کافی تھا اور نفسیاتی تکمیل کے لیے تھا وجے کمار۔ لاجونتی کی تمنا تھی کہ باقی ماندہ زندگی اسی طرح پنڈولم کی مانند بسر ہو۔ البتہ وجے کمار اس بندھن کو قانونی شکل دینے پر اصرار کرنے لگا۔

وجے کمار کے تقاضے سے وہ گھبرا گئی۔ ادھر کنواں تھا اور ادھر کھائی۔ نجات حاصل کرنے کے لیے اُس نے اپنی چھوٹی بہن امرتا کو آگے کر دیا۔ امرتا ایسی بھیڑ تھی جس کو جدھر چاہو ادھر ہانک لو۔ اُس نے امرتا کو اپنے پاس بلایا، وجے کمار سے تعارف کرایا اور خود پس منظر میں چلی گئی۔ وہ کچن میں نئی نئی ریسی پیز (recipe) پڑھ کر وجے کمار کی خاطر داری میں جٹی رہی۔ آخر کار تیر نشانے پر لگ ہی گیا۔ نفسی تشنگی اور باہمی قربت نے وجے کمار اور امرتا کو ایک کر دیا۔ لاجونتی اسی موقع کی تلاش میں تھی۔ اُس نے شادی کا نقارہ بجوا دیا۔

شادی کے ہنگامے میں لاجونتی ہی ایک ایسی عورت تھی جس کے چہرے پر فاتحانہ مسرت جھلک رہی تھی۔ جہاں دیکھو وہاں لاجو ہی لاجو تھی۔ جس سے بات کرو وہ لاجو کی

چرچا کرتا۔ بیچاری امرتا تو محض ایک روبوٹ بن کر رہ گئی تھی جس کو صرف دلہن کا جوڑا پہنایا جا چکا تھا۔ لگن منڈپ پر اس کو ایسے لے جایا گیا جیسے کوئی بھیڑ ذبح خانہ لے جائی جاتی ہے۔ وہ بوجھل قدموں سے آتم سمرپن کے لیے بڑھتی چلی گئی۔

وجے بھی زندگی کی بازی میں مات کھا گیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ لاجونتی نہ سہی امرتا ہی سہی۔ آخر ایک ہی گھر کی دونوں بیٹیاں ہیں۔ ایک ہی بطن سے پیدا ہوئی ہیں۔ امرتا میں بھی وہی خوبیاں ہوں گی جو لاجونتی میں ہیں۔ اتنا ہی نہیں امرتا کے ساتھ رشتہ جوڑنے سے لاجونتی کا قرب بھی حاصل ہوتا رہے گا۔ مگر وہ نسوانی نفسیات سے بے خبر تھا۔ کوئی بھی عورت چاہے وہ گونگی بہری ہی کیوں نہ ہو، دوسری عورت کی موجودگی ہرگز پسند نہیں کرتی۔

وہ امرتا میں لاجونتی کا روپ ڈھونڈنے لگا مگر امرتا کبھی لاجو نہ بن سکی۔ لاجونتی تو کب کی جا چکی تھی۔ اب تو بس امرتا ہی امرتا رہ گئی تھی۔ جو صرف میٹرک پاس تھی۔ جس کو کھانا پکانے کی کوئی تمیز نہ تھی۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کی کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ لاجونتی کی ضِد تھی۔

وجے کمار کی آنکھوں پر سے جب پردہ ہٹا تو وہ بوکھلا گیا۔ پینتیس سال کی تپیا سب خاک میں مل چکی تھی۔ منہ موڑ کر وہ پھر ارچنا کی طرف مائل ہوا۔ روتے بسورتے اس نے اپنی پشیمانی کا اظہار کیا اور اپنی غلطی کا اعتراف بھی۔ سارا قصور لاجونتی اور امرتا کے کاندھوں پر لاد کر اس نے اپنی معصومیت کا جواز پیش کیا۔ ارچنا پسیج گئی۔ ارچنا ہی کیا کوئی بھی لڑکی اپنے عاشق کے آنسو دیکھ کر پسیج جاتی۔ اُس نے وجے کمار کو معاف کر دیا۔ وجے کمار کی جان میں جان آ گئی اور اُس نے زندگی کا ایک نیا باب شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کئی مہینوں بعد شیکھر کی ملاقات وجے کمار کے ساتھ کورٹ کامپلکس میں ہوئی۔ کچہری میں شیکھر کی موجودگی کی وجہ اس کے اور لاجونتی کے بیچ طلاق کا مقدمہ تھا جو شیکھر نے آخر کار دائر کر ہی لیا تھا۔

''ہیلو وجے! آپ اور یہاں'' شیکھر نے وجے کمار کا دھیان اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا۔

''آج تاریخ پڑی ہے'' وجے کمار نے جواب دیا۔

''کس کی تاریخ......؟'' شیکھر پھر پوچھنے لگا۔

''میں نے امرتا کو طلاق دینے کے لیے کورٹ میں عرضی دی ہے'' وجے کے ہمراہ سیاہ کوٹ زیب تن کئے ایک وکیل بھی تھا۔ اس کا تعارف کرانے کے لیے وجے کمار پھر گویا ہوا۔

''آپ ہیں انل ڈھینگرا۔ ارچنا کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ انل جی ارچنا کے بڑے بھائی صاحب ہیں۔ میرے کیس کی پیروی کر رہے ہیں۔''

''اوہ میں سمجھا'' شیکھر کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اور آپ کیسے، شیکھر صاحب؟'' وجے کمار شیکھر سے مخاطب ہوا۔

''اتفاقاً میرے کیس کی تاریخ بھی آج ہی پڑی ہے۔ میں بھی لاجونتی سے الگ ہو رہا ہوں''۔ شیکھر نے متانت سے جواب دیا۔

لاجونتی کا نام سنتے ہی وجے کمار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ یکایک اُس کے چہرے پر ایک امید کی لہر دوڑ گئی جو ڈھینگرا صاحب کو دیکھتے ہی کافور ہوگئی۔ اس قلیل وقفے میں اُس کے ذہن نے لاجونتی، امرتا اور ارچنا کے بیچ کا فاصلہ طے کر لیا۔

اور پھر دس سال یوں ہی گزر گئے۔ تاریخیں لگتی رہیں۔ کالے گاؤن پہنے وکیل آتے رہے اور جاتے رہے۔ مِسلوں پر دھول جمتی رہی اور پھر جھڑتی رہی۔

بار بار وہی نام دہرائے جاتے۔ شیکھر سوری......ولد رام لال سوری حاضر ہو.....!

لاجونتی زوجہ شیکھر سوری.......حاضر ہو........!

منصف پھر بھی طے نہیں کر پا رہا تھا کہ ان دو بے میل روحوں کو ابھی لٹکائے رکھے یا پھر الگ کر دے۔

☆☆☆

کینچلی

کافی ہاوس کے فیملی کیبن میں وہ اپنی رام کہانی سنا رہی تھی اور میں کافی کی چسکیاں لیتا ہوا اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی بلکہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی عورت تھی جس کے خاندان کا ڈنکا نہ صرف انگریزوں کے زمانے میں بلکہ اُسے پہلے بھی دورِ مغلیہ میں بجتا رہا۔ غیر معمولی خدمات کے عوض اس کے آبا واجداد کو دلی کے گردونواح میں کئی جاگیریں عطا ہو چکی تھیں مگر حالات کی ستم ظریفی نے نجمہ کو ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں وہ اپنے آپ کو بے بس و بے سہارا پا رہی تھی۔ نجمہ کی شکل وصورت دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ بنجر زمین پر ایستادہ اُس کھوکھلے پیڑ کی مانند ہے جو وقت کی آندھیوں سے پسپا ہو چکا تھا اور اب آخری طوفان کے جھکڑ کا انتظار کر رہا تھا جو اُس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا۔ نجمہ کے بالوں کی گُتھن، چہرے کے میک اپ اور وضع قطع سے اُس کا ماضی صاف جھلک رہا تھا جس کے ساتھ وہ ایک بیل کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

''بیٹے! میں کوئی بھیک منگی نہیں ہوں۔ میرے ابا بہت بڑے زمیندار تھے۔ دلی کے مضافات میں کئی جاگیروں کے مالک تھے۔ بہت ہی لاڈ پیار سے پالا تھا انہوں نے مجھے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ ''شادی کیا ہوئی کہ ساری کایا ہی پلٹ گئی۔ کتنی امیدیں لے کر میں ڈولی میں بیٹھی تھی۔ سونے سے لدی ہوئی، سہاگ کا جوڑا پہنے ابھی میں ان کا انتظار ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی میری ساس چھاتی پیٹتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ چلا رہی تھی۔ ''ارے بہو، اب کس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس

* یہ کہانی پہلی بار ہفتہ وار رفتار جموں میں غالباً 1973میں چھپی تھی۔

کوتو گورے اُٹھا کر لے گئے۔'' میری تو ہوائیاں اُڑ گئیں۔ ساری رات روتے بسورتے نکل گئی۔ پھولوں کی سیج بھی انتظار کرتے کرتے سوکھ گئی۔

وہاں وہ تھے بیچارے جیل کی کوٹھری میں پوری رات تڑپتے رہے۔ خبط تھا ان کو آزادی کی صبح دیکھنے کا۔ نہ رات کی خبر رہتی تھی اور نہ دن کا پتا۔ کھدر کے کپڑے زیب تن کر کے صبح وشام بس غریب، لاچار اور پسماندہ لوگوں کی خدمت کرنا اور اُن کے بجھے ہوئے دلوں میں حب الوطنی کے چراغ جلانا ان کی زندگی کا نصب العین بن چکا تھا۔ حکومت نے کئی بار اعلیٰ نوکریوں کی پیش کش کی مگر انہوں نے ہر بار ٹھکرا دیا۔ ہسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے تھے۔ اخبار 'کارواں' کے ناشر و مدیر تھے۔ اور وہی اخبار ان کی آرزوؤں کا مرکز بن چکا تھا۔

بٹوارہ کیا ہوا کہ ہزاروں لاکھوں معصوموں کی جانیں تلف ہوگئیں۔ سرحد پار سے ہندو اپنے گھر بار چھوڑ چھاڑ کر بھاگے چلے آرہے تھے اور یہاں سے مسلمان اپنی جانیں بچانے کے لیے سرحد کے اُس پار چلے جارہے تھے۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے؟ وہ منزل تک پہنچے گا بھی یا نہیں؟ وہ راستے میں انسانی درندگی کا شکار بھی ہوسکتا تھا۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ اُس کی زندگی کی یہ پہلی اور آخری ہجرت تھی اور اس کے بعد وہ کبھی اپنے آبائی وطن کا منہ بھی نہ دیکھ پائے گا۔ قافلوں کے قافلے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی جانب چلے جارہے تھے۔

شریف الدین چونکہ کانگریسی تھے اور گاندھی جی کی پرستش کرتے تھے، دلی چھوڑنے کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ کئی ساتھیوں اور ہمدردوں نے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، تاکید کی کہ اب یہاں خیر نہیں۔ آدمی آدمی کے خون کا پیاسا بن چکا ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ آل وعیال لے کر پاکستان ہجرت کرو ورنہ کیا معلوم کس دن کیا حشر ہوگا۔ لیکن وہ کس کی سننے والے تھے۔ اُلٹے دوسروں کو سمجھانے بجھانے لگتے کہ بھائی یہ موسمی بارش ہے۔ چندروز میں تھم جائے گی۔ وہ دیگر کانگریسیوں کے ہمراہ سرحد پار سے آنے والے

شرنارتھیوں کو پھر سے بسانے میں جٹ گئے۔ دن کا ٹھکانہ نہ رات کی خبر۔ صبح سے شام تک شرنارتھی کیمپوں میں غریب بے سہارا رفیوجیوں کو بحال کرنے میں جٹے رہتے۔ آدھی رات کو گھر لوٹ آتے۔ خیر خواہ ہندو ہمسایوں نے جب یہ حال دیکھا تو تنبیہہ کی کہ کم سے کم رات کو جلدی گھر لوٹ آیا کرو لیکن وہ کہاں مانتے۔ ان کے ذہن پر ایک ہی دھن سوار تھی اور وہ تھی اپنے پسینے سے صبح آزادی کی چادر پر پڑے لہو کے چھینٹوں کو دھوڈالنا۔

ایک رات وہ گھر لوٹ رہے تھے۔ راستے میں دنگائیوں کے بیچ کسی بات پر بلوا ہوا اور وہ اُس کی زد میں آ کر شہید ہوئے۔ میں تو ساتھ تھی نہیں مگر سنا ہے کسی بلوائی نے اُن کو پہچان لیا تھا اور مسلمان ہونے کے ناطے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا تھا۔ ساری رات لاش وہیں سڑک پر پڑی رہی۔ دوسرے دن علی الصباح رفیوجی کیمپ کے شرنارتھی خون میں لتھڑی ہوئی لاش تکریم سے گھر لائے۔ صحن میں بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا۔ چار سو ہو کا عالم تھا۔ آس پاس کے سبھی پڑوسی واویلا مچانے لگے۔ میں لاش کو دیکھ کر ہی سکتے میں آ گئی۔

اس سانحہ کے باوجود میں اور میری بیٹی شگفتہ اپنی دھرتی پر جمے رہے حالاں کہ باقی سب قریبی رشتے دار پاکستان منتقل ہو چکے تھے۔ بیٹے، بسی بسائی دنیا لٹتے دیر نہیں لگتی۔ زمین و جائیداد پر غنڈوں موالیوں نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ باقی جو سونا اور زیور بچ گیا تھا وہ سب کچھ دھیرے دھیرے بک گیا۔ اب صرف ایک آبائی مکان رہ گیا ہے جس کی بوسیدہ دیواروں پر میرے خاندان کی کہانی لکھی ہوئی ہے۔

حکومت نے شہیدوں کے کنبوں کو وظیفہ دینے کا اعلان کر دیا۔ میں بھی وظیفہ خواہوں کی صف میں کھڑی ہو گئی لیکن وہاں کی صورت حال دیکھ کر کوفت ہوئی۔ قطار میں زیادہ تر وہ لوگ کھڑے تھے جو لوٹ مار کرنے میں پیش پیش رہے تھے اور جن کو حب الوطنی سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر دودو ہاتھوں سے دیش کو لوٹ رہے تھے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جنہوں نے سچ مچ قربانیاں دی تھیں ان کا تو کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔ جب میری باری آجاتی تو مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو جاتی۔ اوٹ پٹانگ سوالوں

کی بوچھار کی جاتی۔ ایک روز کسی افسر نے ایسا سوال کیا جو میرے دل میں نیزے کی طرح چبھ گیا۔ ''آپ تو مسلمان ہیں پھر آپ کیسے دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کے شوہر شہید ہو چکے ہیں؟ اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ دیش بھگت تھے، بلوائی نہیں تھے؟'' میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں چپ رہی۔ شہادتیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تھک گئی۔ وہ تو چلو خیر ہوئی کہ ایک واقف کار کانگریسی نیتا نے، جو انسپکشن پر آیا تھا، مجھے پہچان لیا اور میری سفارش کی ورنہ تو میں کب کی امید چھوڑ چکی تھی۔

وظیفہ تو خیر ملتا رہا۔ پر اس قلیل رقم پر گزر بسر کرنا مشکل ہو گیا۔ اُدھر شگفتہ تھی کہ باپ کی موت اور مجرد زندگی سے بوکھلا گئی۔ صدمہ برداشت نہ کر پانے کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھی۔ روز بروز حالت بگڑتی ہی جا رہی تھی۔ جب دوا دارو سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو ہر جمعرات کو حضرت نظام الدین اولیہؒ کی درگاہ پر حاضری دیتی رہی کیونکہ وہی سہارا باقی رہ گیا تھا۔ ایک روز واپس آتے وقت ایک خوبرو نوجوان سے اچانک ملاقات ہوئی جو شگفتہ کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ ہمارے گھر کے چکر لگاتا رہا اور میں نے موقعہ پا کر اس کو اصلیت سے باخبر کر دیا۔ وہ شگفتہ بیٹی کو اتنا چاہنے لگا تھا کہ اس کی صحت یابی کے لیے انتھک کوششیں کرتا رہا۔ کئی اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے شگفتہ کا معائنہ کروایا۔ وقتاً فوقتاً ہماری مالی امداد بھی کرتا رہا۔ وہ ہمارے وجود پر اتنا غالب ہو چکا تھا کہ میں نے اُس کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ صرف اتنا جانتی تھی کہ اس کا نام بشیر احمد ہے اور وہ اشوکا ہوٹل میں کسی کشمیری قالین کی دوکان میں سیلز مین کا کام کرتا ہے۔

چند مہینے گذر جانے کے بعد ایک روز وہ گھر نہیں آیا اور اُس روز کے بعد پھر وہ کبھی ہمارے گھر نہیں آیا۔ کچھ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ کہاں چلا گیا۔ حالات کی وجہ سے میں خود اس کو ڈھونڈنے نہیں جا سکی تاہم جن لوگوں کو یہ کام سونپ دیا وہ سر لٹکاتے ہوئے واپس چلے آئے۔ اِدھر شگفتہ کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے تو میں نے شگفتہ کو چلڈرن ری ہیبلٹیشن (Rehabilitation) سنٹر میں داخل کروایا۔ اس کی حالت میں کچھ بھی

سدھار نہ ہوا۔ اس لیے مینٹل اسائلم میں منتقل کرنا پڑا۔ مہینے میں ایک دو بار اس کو دیکھنے چلی جاتی تھی۔ جن دنوں ری ہیبلیٹیشن سنٹر میں تھی کبھی کبھار خط لکھا کرتی مگر جب دماغی حالت بگڑتی چلی گئی تو خط آنے بھی بند ہو گئے۔''

نجمہ نے شگفتہ کا ایک خط، جو اس کے پرس میں پڑا ہوا تھا، نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ میرے تجسس کا یہ عالم تھا کہ میں چیتے کی طرح اس خط پر جھپٹ پڑا اور اس کو کھول کر پڑھنے لگا۔

پیاری امی...... السلام علیکم!

کیسی می ہو تم۔ ان لوگوں نے ابا کو پھٹاک پھٹاک مار دیا اور تم نے بچایا بھی نہیں۔ اب مجھے بھی یہاں بند کروا کر اکیلا چھوڑ دیا۔ اور خود گھومتی پھرتی ہو۔ ویری گڈ! می ویری گڈ! گھومتی رہو۔ عیش کرتی رہو۔ فلمیں دیکھتی رہو۔ چاٹ کھاتی رہو۔ جو جی میں آئے کرتی رہو۔ ابو کہتے تھے کہ ایک دن ہم سب زندہ ہو جائیں گے۔ اُس دن میں ابو سے شکایت کروں گی کہ می کتنی خراب ہے۔

وہ جو میرے کھلونے ہیں ناں میری الماری میں انہیں ہاتھ مت لگانا۔ مجھے وہ کھلونے اپنے ساتھ سسرال لے جانے ہیں۔ گڈے اور گڑیا کی شادی رچانی ہے۔ بینڈ باجے کا انتظام کرنا ہے۔ وہ بشیر ہے نا اس کو بھی بلانا ہے۔ ویری گڈ می ویری گڈ۔

می مجھے یہاں اکیلے اکیلے بہت ڈر لگتا ہے۔ بھیانک سپنے بار بار آتے ہیں۔ کل معلوم ہے میں نے کیا دیکھا؟ ایک بوڑھی ناگن .... جھاڑی کے پاس.....وہ اپنے بدن کو جھاڑی سے رگڑ رگڑ کر اپنی کینچلی سے آزاد ہونا چاہتی تھی مگر شٹ اَپ ہو گیا اُس کا۔ نہیں نکل پائی۔ مر گئی۔ می مجھے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے۔ کہیں تم بھی تو نہیں مرو گی۔ پھر میرا کیا ہو گا۔

ویری گڈ۔ تمہاری ویری گڈ بیٹی

شگفتہ

خط کو پڑھ کر میں نے نجمہ سے پوچھا۔ ''اتنے سالوں کے بعد آج اشو کا ہوٹل آنے

میں کیا تُک تھی؟''

''کل میں گھر کی الماریوں کی صفائی کر رہی تھی۔ ردّی کاغذات میں سے یہ خط برآمد ہوا۔ پڑھنے کے بعد مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں پھر درگاہ پر حاضری دینے چلی گئی۔ وہاں ایک نوجوان پر نظر پڑی جس کی شکل وصورت بشیر احمد سے ملتی جلتی تھی۔ بہت کوشش کی میں نے کہ اس کے پاس جا کر دو باتیں کرلوں لیکن وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اسکوٹر پر بیٹھ کر غائب ہوگیا۔ پھر دل میں اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ خود ہی اشوکا ہوٹل جا کر بشیر کے بارے میں پتا لگاؤں۔ کہیں سے کچھ تو سراغ مل جائے گا۔ ہوسکتا ہے وہ پھر سے وہاں کام کرنے کے لیے آیا ہو۔ بہر حال اسی بہانے تم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ دراصل میں کئی مہینوں سے مالی تنگدستی سے پریشان ہو چکی ہوں۔ سوچا تھا شاید بشیر احمد مل جائے۔ تو اس سے کچھ مدد مانگ لوں گی۔'' نجمہ کے چہرے سے تصنع کی پرتیں ایک کے بعد ایک اُترتی جا رہی تھیں اس کے گالوں پر بڑھاپے کی جھریاں اب واضح ہونے لگی تھیں اور اس کی آواز میں ارتعاش پیدا ہونے لگا تھا۔

''اچھا تو یہ بات ہے''۔ میرے چہرے پر استفہامیہ نشان اُبھر آیا۔

''ہاں بیٹے، یہی سوچ کر آئی تھی۔ کئی مہینوں سے وظیفہ نہیں ملا۔ جب بھی جاتی ہوں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر واپس بھیج دیتے ہیں وہ لوگ۔''

''آپ کچھ کام کیوں نہیں کرتیں؟ آخر آپ پڑھی لکھی تو ہوں گی۔ کچھ ہنر تو ہوگا آپ کے پاس''۔

''ارے بیٹا، گریجویشن کی ہے میں نے۔ مگر گھر سے باہر کام کرنے کا رواج تو ہمارے خاندان میں تھا ہی نہیں۔ ساری تعلیم بے کار گئی۔ پھر میں نوکری پر کیسے جا سکتی؟''

''اوہ میں سمجھا۔ وظیفہ لینے کے لیے قطار میں کھڑے رہنے میں کوئی شرم نہیں مگر کام کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔ کیسے دقیانوسی خیالات ہیں آپ کے۔ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کی اس حالتِ زار سے مرحوم شریف الدین کی روح کس عذاب میں ہوگی؟ جو

شخص دنیا کے عیش و آرام کو ٹھکرا کر عوام کی خدمت کو اپنا فرض اولین سمجھتا تھا۔ کیا اُس کی روح اپنی بیوی اور اکلوتی بچی کی اس کسمپرسی پر تلملا نہیں رہی ہوگی؟ جب آپ وظیفہ خواہوں کی قطار میں کھڑی ہوتی ہوں گی تو کیا ان کی روح پر ضربیں نہیں پڑتی ہوں گی؟ محترمہ! آپ اپنے آپ سے، اپنی بچی سے اور پھر اپنے مرحوم خاوند سے فریب کر رہی ہیں۔ اس استخواں فروشی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ آپ میں اتنی ساری صلاحیتیں ہیں، پڑھی لکھی ہیں، ہنرمند ہیں، ذہین ہیں، پھر آپ یہ تصنع بھری زندگی بسر کرنے پر کیوں مصر ہیں؟ مانا کہ آپ جاگیرداروں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ بیتے ہوئے کل میں آپ کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ مگر وقت کے ساتھ بدلنا ہر انسان کا فرض بنتا ہے۔ اگر آپ نے چاہا ہوتا تو شریف الدین کے بعد آپ بھی میر 'کارواں' بن سکتی تھیں۔ آپ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ان کا نام روشن کر سکتی تھیں۔ اس کے برعکس آپ نے ایک آرام طلب اور بناوٹی زندگی کو اپنا لیا جس نے آپ کی قوتِ تخلیق کو مفلوج کر دیا۔ محترمہ، مجھے یقین ہے کہ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ آپ اب بھی اپنی بچی کچھی زندگی کو تخریب کے بدلے تعمیر کی راہ پر ڈال سکتی ہیں۔ اس بناوٹی اور مصنوعی دنیا کے جال کو کاٹ کر آپ نئی زندگی کی شروعات کر سکتی ہیں۔ شگفتہ نہ سہی، اس جیسی کئی بے بس اور بے سہارا لڑکیوں کی زندگی کا آسرا بن سکتی ہیں''۔ نجمہ کی موجودہ حالت سے متاثر ہو کر میرے اندر کا خطیب جاگ اُٹھا تھا۔

میری تقریر سنتے ہی اس کی آنکھوں میں امیدوں کے چراغ جل اٹھے۔ میں دل ہی دل میں اپنی اس جیت پر فخر محسوس کرنے لگا۔ مجھے ایسا گمان ہونے لگا کہ وہ میری باتیں سمجھ گئی اور اب اپنی زندگی سنوارنے کی بھرپور کوشش کرے گی۔

کافی ہاؤس سے نکل کر میں اس کے ہمراہ سیکرٹریٹ پہنچا اور وہاں اپنے رسوخ سے اس کا وظیفہ ریلیز کروایا اور پھر مطمئن ہو کر گھر لوٹ آیا۔

سات مہینے یوں ہی گزر گئے۔ ایک روز آفس میں کسی بات پر میری اپنے باس سے تو تو میں میں ہوگئی۔ دل رنجیدہ لے کر میں سیدھے کافی ہاؤس پہنچ گیا۔ ابھی کرسی پر بیٹھ ہی

رہا تھا کہ سامنے فیملی کیبن پر نظر پڑی جہاں ایک جانی پہچانی عورت بڑے ٹھاٹ سے بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شوخ میک اپ تھا اور رنگے ہوئے ہونٹوں پر وہی مصنوعی تبسم چسپاں تھا جسے میں کئی مہینے قبل آشنا ہو چکا تھا۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور پھر اپنا منہ دوسری جانب پھیر کر مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں تاریخ دیکھی۔ مہینے کی پانچویں تاریخ تھی۔ میں سمجھ گیا۔ نجمہ نے شاید مہینے کا وظیفہ اسی دن پایا تھا۔



ڈرِفٹ وُڈ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں فوج میں نوکری کرتا تھا۔ میرا ایک دوست تھا کرنل کول۔ اُس کو ڈرفٹ وُڈ جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ڈرفٹ وڈ۔ یعنی درختوں سے کٹی ہوئی ٹوٹی پھوٹی، بے جان سوکھی ہوئی ٹہنیاں جنہیں آندھی، طوفان یا پھر طغیانی اپنے ساتھ بہا کر لاتی ہے۔ لکڑی کے بے معنی ٹکڑے جنہیں اگر کرنل کول نہ چنتا تو کوئی غریب دیہی مزدور اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے چولہے میں جھونک دیتا۔ کرنل کول ہر اُس شاخ کو اپنے ڈرائنگ روم کی زینت نہیں بناتا تھا جو پیڑ سے ٹوٹ کر زمین پر بکھر جاتی یا جس پر اُس کی نظر پڑتی۔ وہ اپنے انتخاب میں بہت ہی محتاط تھا۔ چھوٹی چھوٹی خمدار ٹہنیاں، جن کی لکڑی مضبوط، پائیدار اور نہ سڑنے والی ہوتی، اس کے لیے فرحت کا سامان مہیا کرتیں۔ کتنی تندہی سے وہ ان بے کار ٹوٹی پھوٹی شاخوں کو تراشتا، چاقو سے اُن کی چھال چھیلتا، پھر ریگ مال سے صاف کرتا اور رنگ وروغن لگا کر انہیں اپنی صناعی خوبیوں اور تخلیقی مہارت سے حسن ومعنی عطا کرتا۔

ہمارا فوجی ڈویژن سالانہ مشق کے لیے دریائے برہم پتر کے کنارے پھیل چکا تھا اور اس ویران علاقے کو، چند دنوں کے لیے ہی سہی، آباد کر چکا تھا۔ خیمے دریا کے کنارے گاڑے جا چکے تھے۔ اس علاقے کی خصوصیت یہ ہے کہ سال بھر کی مسلسل بارش کی وجہ سے یہاں کی زمین نباتات سے ڈھکی رہتی ہے۔ ایک روز کرنل کول اور میں نور کے تڑکے دریا کے کنارے ٹہل رہے تھے کچھ فاصلہ طے کر کے اس کے قدم خود بخود رُک گئے اور وہ پیچھے مڑا۔ اُس کی نظریں دور ریت پر پڑے ہوئے کج لکڑی کے ٹکڑے پر جم گئیں۔ دوڑ کر وہ اس لکڑی پر عقابی پھرتی سے یوں جھپٹا جیسے کوئی نایاب شئے پالی ہو۔ اور پھر وہ اس لکڑی کے

ٹکڑے کو ہاتھ میں اُٹھائے چلتا رہا۔ اس کی کیفیت ایسے غوطہ خور کی سی تھی جو سمندر میں ڈبکی لگا کر بیش بہا موتی نکال کر لایا ہو۔ انتہائی مسرت سے وہ بول پڑا۔

''کرنل سپرو! سی وہاٹ اے بیوٹی اِٹ از! یہ دیکھئے کتنی نیچرل بیوٹی ہے اس وُڈ میں۔ یہ دیکھئے اس طرف..... یہ سارس کی چونچ .... یہ دو لمبی لمبی ٹانگیں........ یہ مڑی ہوئی گردن....... یہ پھیلائے ہوئے پنکھ...... کیا آپ کبھی بھرت پور سینکچوری گئے ہیں۔ پیس بی ٹو دی سول آف ڈاکٹر سلیم علی۔ میں نے ایسا ہی ایک سارس وہاں دیکھا تھا۔''

وہ بولتا رہا اور میں ڈرفٹ وڈ کو مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا۔ مجھے نہ تو اس میں کہیں کوئی چونچ نظر آئی اور نہ ہی مڑی ہوئی گردن۔ ایسی کئی سوکھی ہوئی لکڑیاں میں روز دیکھ کر نظر انداز کر دیتا تھا۔

دو ایک روز کے بعد جب میں کرنل کول کے خیمے میں داخل ہوا تو اس ڈرفٹ وڈ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تو سچ مچ ہی ایک خوبصورت سارس بن چکا تھا۔ اپنے خیمے میں واپس لوٹ کر میں اس ڈرفٹ وڈ کے بارے میں سوچتا رہا جو کرنل کول کے خیمے کی تزئین میں سب سے اہم رول ادا کر رہا تھا۔ وہی ڈرفٹ وڈ جو اپنی جڑ سے کٹ کر ہواؤں کے تھپیڑوں سے نرم گیلی ریت پر بکھرا پڑا اپنے حشر کا انتظار کر رہا تھا۔

کرنل کول کے ساتھ میری جانکاری کوئی نئی نہیں تھی۔ دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے۔ ایک ہی اسکول میں پڑھائی کی تھی۔ ایک ہی سال میں این ڈی اے میں داخلہ لیا تھا اور پھر دونوں جیک ایل آئی میں الاٹ ہوئے تھے۔ غرض کہ ساری عمر ایک ساتھ کٹی تھی۔

مشق ختم ہوئی۔ ہم واپس گوہاٹی کنٹونمنٹ پہنچے جہاں ہمارے بال بچے کب سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

کئی روز بعد میں اپنی بیوی کے ہمراہ کرنل کول کے گھر چلا گیا۔ وہاں ڈرائنگ روم میں وہی ڈرفٹ وڈ نمایاں طور پر ایک کونے میں میز پر رکھا ہوا تھا۔ مسز کول نے، جو جاپانی اِکے

بانا سجاوٹ میں مہارت رکھتی تھی، ایک دلفریب گلدستہ ڈرفٹ وڈ کی بغل میں یوں سجا رکھا تھا کہ اُس کی خوبصورتی دوبالا ہو چکی تھی۔

میری بیوی کرنل کول کی بیوی کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے کچن کے اندر چلی گئی۔ کرنل کول نے اُٹھ کر اپنا وائن کیبنٹ کھولا اور دو گلاسوں میں اسکاچ انڈیلنے لگا۔ دریں اثنا مجھے اُس ڈرفٹ وڈ کو غور سے دیکھنے کا موقعہ ملا جس کو کرنل کول نے میری آنکھوں کے سامنے برہم پتر دریا کے کنارے پایا تھا۔ جس میز پر وہ ڈرفٹ وڈ، جواب سارس لگ رہا تھا، اور گلدستہ رکھا ہوا تھا، اسی میز پر کرنل کول کی اکلوتی بیٹی سُمن کا فوٹو بھی رکھا ہوا تھا۔ سُمن کا فوٹو دیکھ کر میں نے کرنل کول سے اپنا گلاس لیتے ہوئے پوچھا۔

''سُمن کی کوئی خبر......؟''

''ہاں، شی از ان دبئی دیز ڈیز.....''اس نے وہسکی کا جرعہ حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے کہا۔

''کیسی ہے......؟''

''اچھی ہے۔ آج کل ایک کمپنی میں پرائیویٹ سیکریٹری کا کام کرتی ہے۔ بہت موٹی رقم ملتی ہے۔ ہر مہینے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی ہے۔ ہمارا کافی خیال رکھتی ہے۔''

''اوہ، یو آر اے لکی گائے۔ آج کل تو بچے ماں باپ کو گھاس بھی نہیں ڈالتے''۔ میں نے تسلی دی۔

رات دس بجے ہم واپس گھر پہنچے۔ میری بیوی تو بستر میں گھستے ہی خراٹے مارنے لگی لیکن میری نیند ہی اُڑ گئی تھی۔ سُمن کی ساری زندگی میری آنکھوں کے سامنے فلمی ریل کی مانند گزرنے لگی۔ وہ جب بھی کسی مصیبت میں پھنس جاتی تھی تو دبے پاؤں میری بیوی کے پاس چلی آتی اور اُس کو اپنا ہمراز بناتی۔ اُسی کے توسط سے مجھے سُمن کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی رہتی تھیں۔

پانچ سال کی طویل مدت کے بعد جب سُمن پیدا ہوئی تھی تو سارا گھر خوشیوں سے ناچ

اُٹھا تھا۔ ویسے بھی کرنل کول نے ازدواجی ذمہ داریاں سنبھالنے میں بڑی تاخیر کی تھی اور اس پر اتنا طویل انتظار وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ لاچار مسز کول کی، جو عمر میں اپنے شوہر سے قدرے بڑی تھی، جان میں جان آئی تھی۔

غیر محفوظ مستقبل سے گھبرا کر اس نے کرنل کول کو کبھی کسی بات پر نہیں ٹوکا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کیا کچھ نہیں ہوا۔ وہ یہ سوچ کر برداشت کرتی رہی کہ اپنے خاوند کو ہر حال میں خوش رکھنا ہی ایک بیوی کا فرض ہے۔ وہ کتنی شراب پیتا ہے؟ کتنے سگریٹ پھونکتا ہے؟ کس شخص سے کیسے تعلقات رکھتا ہے؟ اپنی بیوی کی بنیادی ضروریات مہیا کرتا ہے یا نہیں؟ ان سب سوالات سے مسز کول کو کوئی سروکار نہ تھا۔ یوں بھی مشرقی عورتیں ان سب بکھیڑوں سے دور ہی رہنا پسند کرتی ہیں۔

سُمن کے پیدا ہونے سے کرنل کول میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ بیشتر وقت سُمن کی پرورش میں صرف ہونے لگا۔ غذا، پوشاک اور تعلیم کیسی ہونی چاہیے اس کا فیصلہ بھی کرنل کول ہی کرنے لگا۔ سینٹ پیٹر اسکول میں داخلہ بھی کرنل کول نے ہی کروایا جہاں سُمن گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ عنفوانِ شباب کی جانب تیزی سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

سُمن کو بچپن ہی سے اپنا انگوٹھا چوسنے کی عادت پڑ چکی تھی جو جوانی تک اس کا ساتھ نہ چھوڑ سکی۔ ماں نے بہت کوشش کی کہ بیٹی کو اس بُری عادت سے چھٹکارا دلوا دے مگر باپ ہمیشہ اُس کے آڑے آتا۔ ''ابھی تو بچی ہے۔ خود ہی سنبھل جائے گی''۔

ماں کو یہ چنتا کھائے جا رہی تھی کہ لڑکی کی اس بُری عادت کی وجہ سے اُس کے لیے بَر ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گا۔ لڑکی بطن سے پیدا ہوئی نہیں کہ ماؤں کو ان کی شادی کی چنتا لگ جاتی ہے۔ لیکن مسز کول کو جس طرف زیادہ دھیان دینا چاہیے تھا اس طرف تو اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ سُمن بچپن ہی سے اپنے باپ کے بستر میں سونا پسند کرتی تھی اور اس عادت سے چھٹکارا پانا مشکل ہو رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مسز کول کو یہ عادت بے ضرر معلوم ہوتی تھی جب کہ انگوٹھا چوسنے کی عادت سماجی لحاظ سے ناقابلِ برداشت تھی۔

سُمن کرنل کول کے ساتھ چپک کر سوتی تھی۔ پہاڑوں کی سردیوں میں ایک دوسرے کی جسمانی حرارت بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ جب سُمن کے جسم میں تبدیلی آنے لگی تو اس قرب نے نئے ہی گل کھلائے۔ ادھر ہر رات شراب پینا کرنل کول کا معمول بن چکا تھا اُدھر شراب کی تاثیر سے اُس کے اعضا کا اعتدال قدرے کم ہونے لگا اور معمولی لمس سے وہ جوش میں آجاتے۔ اوائل شب میں کرنل کول سُمن کے بدن پر اپنے ہاتھ پھیرتا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگلیوں کی یہ کھوج بہت آگے نکل جاتی۔ دوسری طرف سُمن کے حواس خمسہ بھی وقت سے پہلے بیدار ہو گئے تھے۔ آخر کار جذبات نے شعور کی لکشمن ریکھا کو پھلانگ کر سُمن کی زندگی میں اُتھل پتھل مچادی۔ اس کا ردِ عمل تضاد سے بھرپور تھا۔ ایک طرف اس کی تشفی کی ایسی حالت تھی جیسے صدیوں کے پیاسے کو پانی ملا ہو اور دوسری طرف کھوئی ہوئی ملکیت کا وہ احساس تھا جو کنوارے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

سُمن کا ردِ عمل کچھ عجیب سا تھا۔ ایسی صورت میں عام طور پر لڑکیاں اپنے آپ سے حقارت کرتی ہیں اور پستی کی گہرائیوں میں گر جاتی ہیں مگر وہ اپنے مغموم دل کو قہقہوں کے پھاہے لگاتی رہی، جسمانی قربتوں سے اپنے مضروب روح کو جھوٹی تسلیاں دیتی رہی اور مردوں کو آلۂ کار بنا کر اپنی زندگی کی راہیں ہموار کرتی چلی گئی۔

کالج کے دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی اس پر بہار سی چھا گئی۔ ماہ پیکر، غنچہ دہن اور نازک اندام۔ وہ جہاں بھی جاتی بجلیاں گرا دیتی۔ خوش باش اور تفنن طبع اتنی جیسے زندگی میں کبھی کسی مصیبت یا غم سے پالا ہی نہ پڑا ہو۔ اُس کے لبوں پر تبسم لپ اسٹک کی طرح ہر دم چپکا رہتا۔ کشمیری لڑکیوں کی رنگت تو ویسے ہی گوری ہوتی ہے مگر یہاں یہ حالت تھی کہ سنگ مرمر بھی شرما جاتا۔ کئی معاشقے بھی شروع ہو گئے۔ کچھ ایک کے بعد ایک اور کچھ ایک ساتھ۔ وہ کھلونوں کی مانند عاشقوں کی گنتی کرتی، ان کے ساتھ چند روز کھیلتی اور پھر توڑ کر پھینک دیتی۔ زندگی سے بدلہ لینے کا اس کا یہ انداز نرالا تھا۔

سُمن کی دلی خواہش تھی کہ وہ بمبئی جا کر ماڈلنگ کرے۔ یہ خواہش اس وقت خاص طور پر ستاتی جب وہ آئینے کے سامنے اپنی دراز ریشمی زلفوں پر اپنا ہاتھ پھیر لیتی۔ کرنل کول تھے کہ بیٹی کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کی ضد پکڑے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سمن نہ تو ڈاکٹر بنی اور نہ ہی انجینئر اور نہ اس کے بمبئی جانے کا انتظام ہو سکا۔

لیکن سُمن ان وقتی ناکامیوں سے کہاں ڈرنے والی تھی۔ اُس نے زندگی میں تتلیوں کی طرح گلوں سے رس چوسنے کی ترکیب سیکھ لی تھی۔ وہ کسی بھی گل کے ساتھ کوئی بھی ابدی ناتا جوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے مفاد کے لیے یاروں دوستوں حتیٰ کہ ماں باپ کا استحصال کرنا اب اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ زندگی کے تلخ تجربات نے سُمن کو ایک اہم سبق سکھایا تھا اور وہ یہ کہ اس کا حسن اور اس کی جوانی ہی اس کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ اپنی جوانی کی معیاد جتنی ہو سکے بڑھا دے۔

ماڈل بننے کا شوق اتنا حاوی ہوا کہ سُمن نے بالکل نئی راہ نکالی۔ اس کے والدین کب سے اس کو بیاہنے کی رٹ لگائے ہوئے تھے۔ ایک روز وہ ابھے کو لے کر اپنے ماں باپ کے سامنے اُن کا آشیرواد لینے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا اور وہ عدالت میں شادی رجسٹر کروا کے آئی تھی۔ کرنل کول نے دیکھ کر بھی ان دیکھی کر لی۔ کرتا بھی کیا۔ اپنی بیٹی کے سامنے وہ کس منہ سے اپنا حق جتاتا۔ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیر کر اُس نے ابھے کا سواگت کیا اور اپنی ساری کلفتیں وہسکی میں گھول کر پی گیا۔ ابھے نے بھی بلا جھجک اس کا ساتھ دیا۔ وہاں کچن میں سُمن کی ماں کڑھائی میں پکوڑے تلتے تلتے چپ چاپ اپنے آنسو پیے جا رہی تھی۔

بمبئی سے ایک ہی مہینے میں خبر آئی کہ سُمن اور ابھے کے بیچ میں جھگڑا ہو چکا ہے اور دونوں نے باہمی طلاق کے لیے کورٹ میں عرضی دائر کی ہے۔

سُمن نے ماڈلنگ کے لیے کئی دروازے کھٹکھٹائے لیکن ماسوا چھوٹے موٹے کاموں کے کوئی خاص بریک نہیں ملی۔ کئی لوگوں کے دل بہلائے، کئی پروموٹروں کے بستر گرم کیے مگر

جس کامیابی کی آس لگائے بیٹھی تھی وہ حاصل نہیں ہوئی۔ بچپن سے بیوٹی کنٹسٹ میں شریک ہونے کا خواب بھی چند ہی مہینوں میں دھندلا گیا۔ جس ایڈورٹزمنٹ کمپنی کے لیے کام کر رہی تھی وہیں کیریلا کی ایک ماڈل سے دوستی کر لی اور اُسی کے ساتھ اکٹھے کمرے میں رہنے لگی۔

لگ بھگ ایک سال گزر گیا۔ سُمن اپنے حال سے مطمئن نہیں تھی۔ اس کا متلون مزاج پھر سے بغاوت کرنے لگا۔ اس ایک سال میں سُمن کو زندگی کی تلخ حقیقتوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ روپے پیسے کی اہمیت کو اب وہ بخوبی جان چکی تھی۔ وہ اس حالتِ زار سے فرار کی متمنی تھی مگر کوئی بھی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا حالاں کہ وہ عدالت سے طلاق بھی حاصل کر چکی تھی۔

نومبر کا مہینہ تھا۔ دو روز کے بعد دیوالی تھی۔ سُمن اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی ٹانگیں سامنے میز کے اوپر رکھ کر چائے پی رہی تھی۔ اکیلے پن سے وہ اُکتا چکی تھی۔ اُس کی سہیلی ایلزبتھ، جس کو وہ پیار سے لِز کہہ کر پکارتی تھی، کمرے میں داخل ہوئی اور بول پڑی۔

''آئی ہیو اے سرپرائز فار یو، مین'' لِز نے قریب آ کر سُمن کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

سُمن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ لِز نے لفافہ ہاتھ میں تھما دیا۔

''دیوالی کا کارڈ ہے.....تمہارے پتا جی کا........دی اونلی مین یُو لَو اِن دِس وَرلڈ'' لِز کے لہجے میں شرارت تھی۔ سُمن لِز کو اپنی زندگی کا راز دان بنا چکی تھی۔

سُمن نے لفافہ کھولا اور کارڈ کو دیکھتے ہی کئی بار چوما۔

''ڈیڈ۔ یو آر سمپلی گریٹ.......میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔ میرا تو دن سپھل ہو گیا۔ آئی لَو یو ڈیڈ....آئی لَو یو''۔

سُمن جب تک کارڈ کو دیکھتی رہی لِز نے دوسرا لفافہ کھول دیا اور سارا خط پڑھ ڈالا۔

''وہ کیا ہے۔ سُو وِیٹ ہارٹ......؟'' سُمن لِز کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''دبئی سے میری بہن کا خط آیا ہے۔ روبی وہاں ایک مشہور اسپتال میں نرس کا کام کرتی ہے۔ اسپتال کے مالک سے کافی اچھے مراسم ہیں۔ یُونو، ہمیں اچھی بریک ملنے کی

امید ہے''۔

''سچ! ٹچ وڈ!'' سُمن کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے جلدی سے پاؤں کے نیچے رکھی ہوئی میز کی لکڑی کو چھوا۔

''ڈارلنگ، اسپتال کا مالک شیخ عبداللہ الکبیر بن المصطفیٰ ایک بہت بڑی رٹیل چین کا مالک ہے۔ یُو، اے، ای کے مختلف شہروں میں اُس کے کئی سُپر بازار ہیں۔ وہ ایک کیمپین شروع کرنے جارہا ہے جس کے لیے اُس کو ہندوستانی ماڈلوں کی ضرورت ہے۔ اتوار کو وہ بمبئ پہنچ رہا ہے۔ دیدی نے میرا حوالہ دیا ہے۔ وہاٹ اے گریٹ سرپرائز...... سُمی! میری صلاح مانو! ائیر پورٹ پر ہی اس کا استقبال کرلیں۔ یُونو' ارینبین سائکی...... وہ تو بس دیکھ کر ہی......'' لِز نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

عبداللہ کی آنکھیں سُمن کو ائیر پورٹ پر دیکھ کر چندھیا گئیں۔ اس کو یہ گمان ہی نہ گزرا تھا کہ بمبئ میں اُس کا انتظار ایسی حسین دوشیزہ کررہی ہوگی۔ دو تین روز ہی میں اس نے اپنا کام نپٹا لیا اور پھر دُبئ واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ رات کے ڈِنر پر اُس نے سُمن اور لز دونوں کو تاج محل ہوٹل میں دعوت دی۔

آمنے سامنے بیٹھ کر وہ سُمن کے ساتھ محوِ گفتگو ہوا۔

''مس سُمن، آئی ہیو این آفر فار یُو۔''

''وہاٹ اِز اٹ''، سمن مسکرا کر بولی۔

''مس سُمن، وہائی ڈونٹ یو کم ٹو دبئ۔''

سُمن اور لز دونوں حیرت زدہ آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی سُمن اپنی مسرت کو چھپا نہ سکی۔

عبداللہ نے سُمن کو پرائیویٹ سکریٹری کے کام کے لیے منتخب کیا اور ماہانہ ڈیڑھ ہزار ڈالر کی تنخواہ مقرر کی۔

سُمن نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ

یہ حقیقت تھی یا وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن کے پردے پر ریمپ پر لہراتی ہوئی سمن ابھر آئی جو بیوٹی کنٹسٹ میں ری جیکٹ ہو چکی تھی۔ ڈھلتی ہوئی عمر نے اُس کے چہرے پر بے شمار شکنیں پیدا کر دی تھیں جن کو وہ میک اپ کی موٹی لیپ سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتی۔

لِز نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ ہاں کر دو۔ سُمن بھی اسی گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔

''اِٹ از آل رائٹ۔ مائی پاسپورٹ از ریڈی۔ یو ارینج فار مائی ویزا''۔ سُمن نے عبداللہ سے آنکھیں ملا کر ہامی بھر لی۔

ویزا کا انتظام ہوا اور سُمن دبئی پہنچ گئی۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ای میل سے اپنے باپ کو اطلاع دی۔ رات میں ماں باپ دونوں سے ٹیلی فون پر بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

کرنل کول کو سُمن کے بے شمار ای میل اور طویل خط آتے رہے جن میں وہ بمبئی اور دبئی کے حالات سے اپنے باپ کو آگاہ کرتی رہی اور ہر خط کے اختتام پر یہی الفاظ دہراتی رہی۔ ''آئی لو یو ڈیڈ...... آئی لو یو......''

دبئی کی اپنی زندگی کے بارے میں سُمن اپنے پتا جی کو وقتاً فوقتاً اطلاع دیتی رہی۔ اُس نے اپنے باپ سے کبھی کچھ بھی نہ چھپایا ماسوا اس کے کہ وہ شیخ عبداللہ الکبیر کے حرم کی زینت بن چکی ہے۔



ڈائننگ ٹیبل

مونا سے میری پہلی ملاقات سرلا آنٹی کے ڈائننگ ٹیبل پر ہوئی۔ شکر کا دن تھا۔ سرلا آنٹی نے اپنی اکلوتی بیٹی الکا کے جنم دن پر بہت سارے لوگوں کو مدعو کیا تھا جن میں میرا نام بھی شامل تھا۔ پارٹی شام کے چھ بجے مقرر تھی تاہم میں مقررہ وقت پر نہیں پہنچ پایا۔ ان دنوں کالج بیڈمنٹن ٹرائلز ہو رہے تھے۔ میچ ختم ہوتے ہی میں دوڑتا بھاگتا، ایک ہاتھ میں جنم دن کا تحفہ لئے اور دوسرے ہاتھ میں بیڈمنٹن ریکٹ اُٹھائے، تقریباً ساڑھے آٹھ بجے سرلا آنٹی کے دروازے پر پہنچا۔ اندر گھسنے میں ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ مصلحت کہہ رہی تھی کہ پارٹی ختم ہو چکی ہو گی، اندر جانا معیوب ہو گا، خاص کر جب کہ اُس فیملی سے میری نئی نئی جان پہچان ہوئی تھی مگر ہاتھ میں دبا قیمتی تحفہ اندر جانے کے لیے اُکسا رہا تھا۔

''اس میں شرمانا ہی کیسا۔ اتنے سارے روپے برباد تو نہ کرو گے۔ اپنے لیے نہیں کم از کم میرے لیے تو اندر چلے جاؤ۔''

اسی کشمکش میں میری انگلی کال بیل کے بٹن کو دبانے لگی۔ دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا۔

پارٹی کب کی ختم ہو چکی تھی۔ سبھی مہمان جا چکے تھے۔ ڈرائنگ روم میں افراتفری کا عالم تھا۔ فرش پر نیلے پیلے ربن، غباروں کے چیتھڑے، کاغذ کے ٹکڑے، گفٹ ریپرس اور گتے کے خالی ڈبے جا بجا بکھرے پڑے تھے۔ البتہ چھت سے لٹک رہے ٹشو پیپرز، پھریرے اور پھولے ہوئے غبارے اُس جشن کی تصدیق کر رہے تھے جو ایک آدھ گھنٹہ پہلے وہاں منایا جا چکا تھا۔ الکا کے ہاتھ میں تحفہ تھماتے ہوئے میں نے معذرت کا اظہار کیا۔

''جنم دن مبارک ہو الکا۔ ہیپی برتھ ڈے۔ آئی ایم ساری فار بی انگ لیٹ''

الکا نے خاموش معصوم مسکراہٹ بکھیر کر میرا خیر مقدم لیا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی منوج۔ ہم تو کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔'' سرلا آنٹی نے اپنی ریشمی ساڑی کا پلو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''آنٹی، آئی ایم ساری۔ ہوا یوں کہ کالج میں بیڈ منٹن ٹرائلز چل رہے تھے۔ آج فائنل سلیکشن تھا۔ اس لیے غیر حاضر رہنا بالکل مناسب نہ تھا''۔

''نیور مائنڈ........ کم اِن........ یہاں تو ڈِنر کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اب تم ڈِنر کھا کر ہی جاؤ گے۔'' آنٹی کے لہجے میں درخواست کم اور حکم زیادہ تھا۔ اور اس تحکمانہ لہجے میں اپنا پن صاف جھلک رہا تھا پھر میں انکار کیسے کر سکتا تھا۔

آنٹی مجھے سیدھے ڈائننگ روم میں لے گئیں۔

''میری سہیلی اور ان کے شوہر سے ملو۔ مرنالنی اور ہیمنت گڈکر۔ اور وہ ہے ان کی بیٹی مونا۔ آج ہی چنڈی گڑھ سے آئے ہیں۔ ہیمنت بینک آف مہاراشٹر کی چنڈی گڑھ برانچ کے منیجر ہیں۔ اور مرنالنی........ شی از اے فری لانسر''۔

ہیمنت اور مرنالنی دونوں کھڑے کھڑے دیوار پر ٹنگی ہوئی پینٹنگز دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے مڑ کر میرا سواگت کیا۔ میں نے بھی دونوں کے ساتھ بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا مگر میری پُر تجسس نگاہیں کہیں اور مرکوز ہو چکی تھیں۔

مونا ڈائننگ ٹیبل کے ایک سرے پر سمٹی ہوئی اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے سے بے بسی، لاچاری اور عاجزی ٹپک رہی تھی۔ جی میں آیا کہ وہیں جا کر اُس سے ہاتھ ملالوں مگر اس خیال سے کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے، مسکراہٹ سے ہی کام لیا۔ اور خود ٹھیک اُس کے مدِ مقابل ڈائننگ ٹیبل کے دوسرے سرے پر کرسی میں بیٹھ گیا۔ میری دائیں جانب الکا اور اس کے ڈیڈی جگ موہن براجمان ہوئے اور بائیں جانب مونا کے ممی ڈیڈی۔

سرلا آنٹی میز سجانے میں مصروف تھیں جب کہ نوکرانی اندر کچن میں پھلکے سینک رہی تھی۔

''بھائی صاحب! آج ہماری پارٹی کھری ہوگئی۔ ہیمنت شرط ہار گئے۔'' مرنالنی

خاموشی کو توڑتے ہوئے جگ موہن سے مخاطب ہوئیں۔

''کونسی شرط؟'' جگ موہن نے پوچھا۔

''وہی پرانا فیڈیار۔ دن میں جو انڈیا پاکستان کا کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔'' ہیمنت گڈکر بات کاٹتے ہوئے بولے۔

سبھی لوگ آپس میں ادھر اُدھر کی باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ ایک مونا تھی جس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے اور دوسرا میں تھا جو اپنے آپ کو بالکل اجنبی سا محسوس کر رہا تھا۔ ہم دونوں اگنورڑ سے محسوس کر رہے تھے۔ مونا اپنے ہی خیالات کے سمندر میں گم تھی۔ اس کا تھکا تھکا وجود اُس کو گھیرے ہوئے تھا۔

لوگ ہمیشہ اپنے اپنے دائروں کے اندر ہی زندگی کا حظ اٹھانا چاہتے ہیں۔ مونا کی بلینک نس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے دائرے کا محیط طے نہیں کر پا رہی تھی۔ ادھر الکا نے شروع ہی سے اپنے دائرے کو محدود کر دیا تھا۔

مونا کو شاید اس بات کا احساس ہو گیا کہ میری آنکھیں اُس کی ہر حرکت کا تعاقب کر رہی ہیں۔ وہ حد سے زیادہ کانشس ہو گئی۔ اس کی حرکتیں دھیرے دھیرے کم ہوتی گئیں یہاں تک کہ وہ ایک موم کا مجسمہ بن گئی۔ غیر شعوری طور پر میں نے اُس کی عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یہی کوئی پندرہ سولہ برس کی لگ رہی تھی۔ اُس ماہ لقا کی صورت سے مریم کی معصومیت ٹپک رہی تھی۔ گول مٹول چہرہ، بھرا بھرا جسم، برگ گل ایسی نرمی ونزاکت اور گلابی رخساروں پر کم سنی کی مہر چسپاں۔ کبھی کبھار ان یاقوتی لبوں پر ہلکی سی اُداسی اُبھر آتی جو دوسرے ہی لمحے کافور ہو جاتی۔ کالے گھنیرے بال آبشار کی چادروں کی مانند اس کی گردن سے مس ہو کر کاندھوں پر پھیل رہے تھے۔ قدرت نے ان ریشمی بالوں کو عجیب سی چمک عطا کی تھی۔ ہلکی سی چربی لئے ہوئے خوشنما ملائم اور فربہ بدن اس بات کی دلیل پیش کر رہا تھا کہ مونا جسمانی ورزش سے پرہیز کرتی تھی۔

ایسے معصوم دلکش چہرے دیکھ کر اچھے اچھوں کا ایمان ڈولتا ہے۔

میں لگاتار مونا کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور اُس کو اپنے شیشے میں اُتارنے کی کوشش کرر ہا تھا۔ مجھے نہ تو اس بات کا احساس تھا کہ میرا فعل بدتہذیبی کی حدوں کو چھونے لگا تھا اور نہ ہی اس بات کی فکر تھی کہ اگر میری چوری پکڑی گئی تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ میں اپنی ہی دھن میں مست تھا۔

مونا کا ردّ عمل بھی کچھ عجیب وغریب سا تھا۔ کبھی اُس کے گلفام چہرے پر امنگوں کا ایسا سیلاب اُمنڈ آتا کہ میرے دل میں اس حسین چہرے کو بوسہ لینے کی شدید خواہش پیدا ہوتی۔ اور کبھی وہی چہرہ پیلا، مغموم اور فکر مند لگتا جس میں کہیں کوئی شدید درد پنہاں تھا جو مونا کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ کبھی اُس کی نگاہوں میں ستاروں کی سی چمک نمودار ہوتی اور کبھی انہی نظروں میں صحراؤں کی ویرانی چھا جاتی۔ کبھی اس کی انگلیوں میں محبوب کے بدن کو چھونے کے لیے ارتعاش پیدا ہوتا اور کبھی وہی انگلیاں ہتھیلیوں پر اُگے ہوئے نرسلوں کی مانند بے جان دکھائی دیتیں۔ اس کا وجود میرے لئے ایک معمہ سا بنتا جا رہا تھا۔

مونا کے بارے میں سوچتے سوچتے میں نے اپنی آنکھوں کے کواڑ بند کر لیے۔ اب میں مونا کو اپنے من کی آنکھوں سے ٹٹول رہا تھا۔

شباب کی دہلیز پر کھڑا ایک چاند کا ٹکڑا۔ اس چاند میں کہیں کوئی داغ نہاں تھا۔ میں نے اس داغ کے سبب کی ٹوہ لینی چاہی۔ کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔ شاید کوئی نفسیاتی پرابلم تھی یا پھر کوئی پرانا گھاؤ۔

خوبصورت چہرے پر رنج والم کی معمولی سی شکن بھی برداشت نہیں ہوتی۔

دریں اثنا سرلا آنٹی نے بریانی کی پلیٹ میرے سامنے ٹیبل پر رکھ دی جس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ آنکھیں کھولتے ہی میری نظریں پھر اُسی مرمریں بت کو ڈھونڈنے لگیں۔ مونا نے ڈائننگ ٹیبل پر دونوں کہنیاں ٹکا کر دونوں ہتھیلیوں کا پیالہ بنا کر اپنے چہرے کو یوں سہارا دیا تھا مانو کوئی کنول کا پھول ہو۔

''اینجو لی، ہماری گیم کا دارومدار صرف تینڈولکر پر ہے۔ وہ ٹک جائے تو جیت یقینی

ہوتی ہے اور جلدی آؤٹ ہو جائے تو ساری ٹیم لڑھک جاتی ہے''۔ مرنالنی کے یہ فقرے مجھے صاف صاف سنائی دیئے۔ میں حیران تھا کہ اتنی دیر سے یہ لوگ گرما گرم بحث میں اُلجھے ہوئے تھے پھر کیوں میں ان کی کوئی بھی بات سن نہیں پایا۔

''منوج بھائی! آپ کہاں کھو گئے ہیں۔ کس کی یاد ستا رہی ہے۔ آپ تو جب سے آئے ہیں تب سے چپ سادھے ہوئے ہیں۔'' ہیمنت گڈ کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''بیڈمنٹن کورٹ میں کسی کو چھوڑ کر تو نہیں آئے؟ ارے بھائی۔ لے آنا تھا ساتھ میں۔ ہم بھی صورت دیکھ لیتے''۔ جگ موہن بول اٹھے۔

مونا امید بھری نظروں سے مجھے بدستور دیکھ رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے منہ سے ایک بھی شبد کیوں نہیں نکل رہا تھا۔ کہیں وہ گونگی تو نہیں........؟ میرا وہم آہستہ آہستہ یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔

سرلا آنٹی نے گرم پھلکوں سے بھرا ہاٹ کیس میز پر رکھ دیا اور خود الکا کے بغل میں بیٹھ کر گویا ہوئیں۔

''کیوں بے چارے کو ستا رہے ہو۔ منوج ویسے ہی کم گو ہے۔ وہ ان جھمیلوں میں نہیں پڑتا''۔

مونا زیرِ لب مسکرانے لگی۔ اُس کی مسکراہٹ میں چھپی سوزش نے مجھے بے چین کر دیا۔

''آپ اتنا خاموش کیسے رہ سکتے ہیں۔ اور وہ بھی جب کرکٹ کے بارے میں بحث چل رہی ہو۔'' مرنالنی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''یونو کرکٹ از مائی فرسٹ لو''۔

اس کے باوجود وہ مجھ سے میری خاموشی نہ چھین سکی۔

''ہاں بھئی۔ سچ کہہ رہی ہے مرنالنی۔ وہ کیا ہے کہ مجھے بھی اُس نے کرکٹ فیلڈ میں ہی آؤٹ کر لیا تھا۔'' ہیمنت گڈ کرنے اپنی بیوی کی تائید کی۔

مجھے ان کی یہ ساری باتیں بے معنی اور فضول لگ رہی تھیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ آپس میں پہلے کی طرح ہی الجھے رہیں اور میں مونا کو دیکھتا رہوں۔ بہر حال ان کا دل رکھنے کے لیے جواباً ''ہوں'' ''ہاں'' کرنا ہی پڑا۔

''لیٹ اس اسٹارٹ'' سرلا آنٹی سبزی کا دونا مرنالنی کے نرم و نازک ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولی۔

یکا یک چمچوں، کانٹوں اور پلیٹوں کی کھنکار نے سارا ماحول بدل ڈالا۔ کمرے میں کئی طرح کی خوشبوئیں پھیل گئیں۔ دھیرے دھیرے اس کھنکار میں باقی ساری آوازیں دب کر رہ گئیں۔

بیچ بیچ میں مونا نظریں چرا کر کن اکھیوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میری مسلسل دلچسپی دکھانے کے باعث اس کا دل پسیج گیا۔ وہ اندر ہی اندر شمع کی مانند پگھل رہی تھی۔

حسن کتنا ہی سنگ دل کیوں نہ ہو جب اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی کے التفات کا مرکز بن چکا ہے تو وہ خود سپردگی کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔

مونا کے لبوں کا ارتعاش، انگلیوں کی تڑپ اور آنکھوں کی چمک اس بات کا واضح ثبوت تھا۔ وہ ہر لحاظ سے میرے موافق تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میرے والدین مونا کو دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھیں گے۔ مشکل صرف یہ تھی کہ میں ابھی طالب علم ہی تھا۔ پڑھائی مکمل کرنے میں ابھی بھی دو سال باقی تھے۔ پتا جی کب کے ریٹائر ہو چکے تھے۔ ابھی تین بہنوں کی شادیاں بھی کرنی تھیں۔ اور پھر کون جانے نوکری کب مل جائے۔

مجھے آگے کیا کرنا چاہیے......؟ آئندہ کام آنے والی تدبیروں کا خاکہ میں اپنے ذہن میں تیار کرنے لگا۔ ایک ہی ملاقات میں دو اجنبی دل اتنے قریب آ جائیں گے اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

اسی دوران میں نوکرانی ڈائننگ ٹیبل سے ترکاریوں کی کشتیاں، جھوٹی پلیٹیں، چمچے، چھریاں اور کانٹے سمیٹ کر لے گئی اور پھر ہمارے سامنے سوئیٹ ڈش رکھ کر چلی گئی۔ میں

نے فیصلہ کرلیا کہ میں مونا سے اپنے دل کی بات کہہ کر ہی دم لوں گا۔ کیا معلوم پھر کبھی ملاقات ہو نہ ہو۔ وہ دو ایک روز میں چنڈی گڑھ واپس جانے والی تھی اور میں یہیں دلی میں پڑا رہتا۔ اس کے بعد مونا سے رابطہ قائم کرنا بعید القیاس تھا۔

''مجھے مونا سے اپنے دل کی کیفیت بیان کرنی چاہیے۔ اس میں چوری ہی کیا ہے۔ میں اس لڑکی کو لوٹ کر تھوڑے ہی لے جا رہا تھا۔'' میں نے خود ہی اپنی ڈھارس بندھائی۔

سوئیٹ ڈش ختم کرنے کے بعد سبھی لوگ ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر مونا بے بس اور لاچار وہیں کرسی کے ساتھ چپکی رہی۔ وہ اپنے والدین کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر پھر وہی یاسیت لوٹ آئی۔ چند ہی ثانیوں میں ہیمنت گڈکر اور مرنالنی واش بیسن میں ہاتھ دھو کر واپس آ گئے۔

مرنالنی ڈائننگ روم کے ایک کونے کی جانب بڑھیں جہاں فرِج رکھا ہوا تھا۔ وہیں فرِج کے پیچھے سے اس نے دو بیساکھیاں برآمد کیں۔ اور مونا کے بازوؤں کے نیچے ٹکا دیں۔ ہیمنت گڈکر نے دونوں ہاتھوں سے اس کو سہارا دے کر کرسی سے اٹھایا۔ مونا نے ایستادہ ہو کر دونوں بیساکھیاں سنبھالیں۔ ایک اچٹتی سی معذور نظر میری طرف دوڑائی اور پھر واش بیسن کی طرف اپنے آپ کو گھسیٹتی رہی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی زبردست بجلی گری ہو۔

''وہ اپنے گرہن لگے وجود کو کب سے گھسیٹ رہی تھی؟'' یہ سوال میرے ذہن کو کچوکنے لگا۔

میں ٹکر ٹکر مونا کی حالت کو دیکھتا رہ گیا۔ میرے چہرے کی ساری رنگت فق ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں جالے اتر آئے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے مونا کوئی تودۂ برف ہو جو سمندر کی سطح پر تیر رہا تھا۔ ایک حصہ ظاہر اور نو حصہ غائب۔

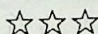
لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی میں اپنی کرسی سے اُٹھ نہیں پا رہا تھا۔ جیسے کسی نے گوند سے چپکا دیا ہو۔ ذہن اتنا مفلوج ہو چکا تھا کہ سوچنے سمجھنے کی ساری طاقت چھن گئی تھی۔

سرلا آنٹی شاید میرے چہرے کے تاثرات بھانپ گئیں۔ وہ میرے قریب آ کر دبی زبان میں سرگوشی کرنے لگی۔

''پوؤر گرل۔ کتنی خوبصورت بچی ہے۔ پولیو نے دیکھو کیا حال کر دیا ہے بیچاری کا۔ دھڑ تو بالکل بے کار ہو گیا ہے۔ ہر تین چار سال کے بعد آپریشن کروانا پڑتا ہے۔ ہیمنت نے اپنی زندگی کی ساری پونجی اسی پر لٹا دی۔ وہاٹ اے مزریبل لائف ڈزشی لو''۔

میں ڈائننگ ٹیبل کے ٹاپ کو حیرت سے گھورنے لگا کیونکہ اُسی کی وجہ سے یہ تلخ حقیقت مجھ سے اتنی دیر پوشیدہ رہی۔ جی میں آیا کہ ہتھوڑا لے کر پورا ٹیبل توڑ دوں۔

دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھوں کے سامنے کہرا سا چھا گیا اور اس کہرے میں سے بار بار دو بیساکھیاں میری جانب ابھرتی چلی آ رہی تھیں۔



ادھورے چہرے

اُس کی سمجھ میں یہ کبھی نہ آیا کہ اوپر کے دو، سامنے کے ایک اور نیچے والے دو فلیٹوں میں جو لوگ آئے اور پھر تبدیلی کے باعث چلے بھی گئے، اس کے انکل اور کزن کیسے بنے؟ کیا رشتوں کے یہ دھاگے اتنے وقتی ہوتے ہیں کہ ہر نیا آنے والا شخص انکل، آنٹی یا کزن بن جاتا ہے اور پھر کچھ دیر کے بعد دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے؟ انسانی رشتوں کی اسی گتھی کو سلجھانے میں نتاشا کی کئی راتیں اضطراب میں بیت گئیں۔

پانچ سال قبل کیشب بھی اپنے والدین کے ہمراہ نچلے فلیٹ میں آیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ اور نتاشا آپس میں اتنے گھل مل گئے کہ ایک دوسرے کے بغیر ایک پل بھی گزارنا مشکل ہو گیا۔ کبھی کیرم، کبھی لوڈو اور کبھی سانپ اور سیڑھی کھیلتے یا پھر پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے بلاکس سے ایک چھوٹے سے گھر کی تعمیر میں جٹ جاتے۔ حالاں کہ کالونی میں اور بھی بہت سارے بچے تھے مگر کیشب اور نتاشا کو ایک دوسرے ہی کی تلاش رہتی۔ نا سمجھی کی وجہ سے نتاشا اُن دنوں اس چاہت کو کوئی نام نہ دے سکی۔ مگر اب اتنے برسوں بعد جب بھی نتاشا اُس رشتے کے بارے میں سوچتی تو اس کے بدن میں لذیذ سی کپکپاہٹ پیدا ہوتی۔ کیشب کا بھولا بھالا معصوم چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہو جاتا اور وہ من ہی من میں مسکراتی۔ مگر کیشب تھا کہ دوسرے سال ہی اپنے پتا جی کے ساتھ واپس بھوپال چلا گیا۔ نتاشا تب سے ایک نئے کیشب کی تلاش میں تھی۔

سامنے والے فلیٹ میں جو آنٹی رہتی تھی اُس کا نام تھا سونیتا اگروال۔ پنجاب یونیورسٹی

یہ کہانی پہلی بار تعمیر ہریانہ چنڈی گڑھ میں غالباً 1973 کے آس پاس چھپی تھی۔

سے اقتصادیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرچکی تھی۔ شادی سے پہلے اُس کے شوہر کے سر پر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنے کا بھوت سوار ہو چکا تھا لیکن شومئی تقدیر یہ کہ شادی کے بعد ڈاکٹر سونیتا کو نوکری کرنے کی اجازت نہیں ملی کیونکہ مسٹر اگروال عورت کی نوکری کے سخت خلاف تھے۔ وہ دن بھر فلیٹ میں اکیلی پڑی رہتی۔ ابتدا میں وہ ایوز ویکلی یا فیمنا کو بار بار پڑھ کر جوں توں کر کے اپنا وقت گزار لیتی مگر رفتہ رفتہ ان کالے حروف سے بھی نفرت ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اخبار کی سرخیاں بھی کاٹنے کو دوڑتیں۔ کالونی کی چند سوشل عورتوں نے بارہا سونیتا کو اپنی کٹی پارٹیوں میں مدعو کیا لیکن سونیتا نے شرکت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے اپنی خلوت ہی سے سمجھوتا کرنا مناسب سمجھا۔

نتاشا دن میں کئی بار آنٹی کے پاس چلی جاتی۔ اُس کو دیکھ کر ہی سونیتا کے چہرے پر عجیب سی رونق چھا جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نتاشا کو اپنی باہوں میں بھینچ لیتی اور اُس کے روئی ایسے گالوں پر ڈاک کی مہروں کی طرح دو چار بوسے چھاپ دیتی۔ نتاشا بے بسی کے عالم میں حیرت زدہ نگاہوں سے آنٹی کو دیکھتی رہتی۔

سونیتا عموماً اپنا بہت سارا وقت ڈریسنگ ٹیبل کے روبرو بیٹھ کر صرف کرتی۔ وہ اپنے سڈول مرمریں جسم کو بار بار آئینے میں دیکھتی۔ کبھی اس زاوئے سے اور کبھی اُس زاویے سے۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر اپنے چہرے کو نہارتی رہتی۔ میک اپ میں دن کا بیشتر وقت گزر جاتا۔ اوپر والے ہونٹ اور ابروؤں کے غیر ضروری بال ہیئر پلکّر کی نذر ہو جاتے۔ چہرے پر ایک کے بعد ایک امپورٹڈ کریموں کے لیپ لگائے جاتے اور پھر غازے کی ہلکی پرت سے چہرہ گلنار ہو اُٹھتا۔ ادھ ترشی بالوں کی لٹیں سونے پر سہاگا کا کام کرتیں۔ سونیتا تھی کہ روز بروز نرگسیت کی دلدل میں دھنسی چلی جا رہی تھی۔ نتاشا کو اُس کا یہ پیارا اور دلفریب روپ بہت ہی اچھا لگتا۔ وہ اپنے من میں سوچتی۔ ”کتنی سوویٹ ہے آنٹی۔ وہاٹ اے بیوٹی! کاش میں بھی بڑی ہو کر اتنی ہی سندر بن جاتی!“

آئینے سے سونیتا کا جی اوب جاتا تو وہ اُٹھ کر کھڑکی کے باہر ایک اچٹتی سی

نظر دوڑاتی۔ تارکول سے لپی پتی سڑک پر، پیلے بف کلر مکانوں پر، دھول میں اٹے ہوئے پیڑ پودوں پر، دھوئیں میں لپٹی ہوئی گاڑیوں پر یا پھر گرمی میں جھلسے ہوئے راہ گیروں پر۔ اُڑتی ہوئی دھول اور مٹی میں وہ کچھ ڈھونڈتی رہتی جیسے برسوں سے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

یہ سب دیکھ کر نتاشا کو اپنی آنٹی پر ترس آتا۔ اُس کو احساس ہونے لگا تھا کہ آنٹی کو ضرور کسی کھوئی ہوئی شئے کی تلاش ہے جس کو وہ اُس غبار میں کھوج رہی ہے۔ ایک دن گھر لوٹتے ہی اس نے اپنے پتاجی سے اس بارے میں استفسار کیا۔

''پاپا وہ سونیتا آنٹی ہے ناں۔ وہ اتنی کھوئی کھوئی سی کیوں رہتی ہے؟ جب دیکھو تب اُداس۔ اُس کے ساتھ کوئی ٹریجڈی پیش آئی ہے کیا؟''

پاپا نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بیٹے! تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔ تمہاری آنٹی کی زندگی میں ایسا خلا پیدا ہو چکا ہے جس کے سبب وہ ہمیشہ مضطرب رہتی ہے۔''

پاپا کے لبوں پر تیرتی ہوئی رازدارانہ مسکراہٹ سے نتاشا کو شک ہوا کہ پتاجی اُس سے ضرور کچھ چھپا رہے ہیں۔ دراصل اس کے پتاجی جو کہنا چاہتے تھے وہ کچھ یوں تھا۔ ''بیٹے! وہ اور اُس کے ہسبنڈ ذہنی طور پر بے میل ہیں۔ ان دونوں کے بیچ میں ایک ایسی ذہنی خلیج پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ان کی نارمل سیکچول لائف بھی درہم برہم ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے تنگ آچکی ہے۔ عورت ہونے کے سبب اُس کو فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔'' مگر یہ سارے الفاظ پاپا کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

''خلا........؟'' نتاشا نے پھر کریدا۔

''ہاں بیٹے۔ شی از این ایمبی شس لیڈی۔ اُس کی اُڑان بہت اُونچی ہے۔ وہ زندگی میں کچھ کر دکھانا چاہتی ہے۔ تعلیم کے دوران میں بھی وہ ہمیشہ امتیازی پوزیشن حاصل کر لیتی تھی۔ چاہتی تھی کہ پڑھ لکھ کر کچھ ایسا کام کرے جس سے اس کا نام روشن ہو۔ سی ہر لک، شوہر ایسا ملا کہ شادی کے پہلے دن ہی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ تب سے وہ پر کٹے پرندے کی مانند اس فلیٹ میں چھٹپٹا رہی ہے۔''

پتاجی کی اس دلیل کو سن کر ماں کی ممتا بغاوت کر بیٹھی۔ وہ بہت کوشش کرنے کے باوجود چپ نہ رہ سکی۔ پتاجی نے ہیومن بی ہیوئیر پر جتنی بھی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا ان سب کا ماحصل پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اُس نے اپنی عمر اور تجربے کے بل بوتے پر ہی اپنی رائے ظاہر کی۔ وہ اپنے خاوند کی کتابی دلیل سے اتفاق نہیں کر سکی۔

''نہیں بیٹی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل سونیتا کی شادی کو چھ سال ہو چکے ہیں۔ آج تک اُس کی گود سونی ہے۔ بہت علاج معالجہ کروایا۔ پیروں فقیروں کے در پر حاضری دی۔ گنڈے تعویز پہنے۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ ہر طرف سے ناکام ہو چکی ہے۔ یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمی ہے۔ سونیتا ہر شئے میں اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی ہے''۔

نتاشا یہ سب دلیلیں سن کر کرشش و پنج میں پڑ گئی۔ اُس کا اپنا اندازہ کچھ اور ہی تھا۔ نتاشا کو پورا یقین تھا کہ آنٹی کو اپنے کالج ٹائم کے بوائے فرینڈ امیتابھ سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ ایم بی اے کرنے کی خاطر امریکہ چلا گیا تھا۔ اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ امیتابھ کے بغیر سونیتا کو اپنی زندگی ادھوری لگ رہی تھی۔ نتاشا کو امیتابھ کے بارے میں جانکاری خود سونیتا نے ہی دی تھی۔ اُس کے سامنے سونیتا آنٹی کئی بار امیتابھ کے ناک نقشے، اس کی ذہانت اور اُس کے امبی شن کا ذکر کر چکی تھی۔

نیچے والے فلیٹ میں ایک بنگالی جوڑا رہتا تھا۔ انکل سے جب بھی کوئی اُس کا نام پوچھ لیتا تو وہ ''اَ'' کا ''اُو'' کر کے جواب دیتے۔ اجوئے بشباش، یعنی 'اجے بسواس' نتاشا انکل کے منہ سے اُس کا نام سن کر کھلکھلاتی۔

اجے بسواس دو سال پہلے کلکتہ سے ایک میڈیم سائز کی ہلکی پھلکی، نرم و نازک بیوی بیاہ کر لے آیا تھا جو شروع شروع میں بنگالی کے سوا کسی اور زبان میں بات ہی نہیں کر پاتی تھی۔ بسواس انکل بیوی کیا لے آیا تھا جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔ رات دن اس کا خیال رکھتا۔ اُس کو انگریزی اور ہندی سکھانے کے لیے ٹیوٹر رکھا گیا۔ فلورڈیکوریشن کورس کے

لیے وائی ڈبلیو سی اے میں داخل کروایا گیا۔ ابھی کورس مکمل ہوا ہی نہیں کہ ہوٹل ہولی ڈے ان کے مینیجنگ ڈائریکٹر، جو خود بھی بنگالی تھے، کی وساطت سے گوپا کو فلورسٹ کی دوکان الاٹ کروادی گئی۔ اجے چونکہ خود محکمہ انڈسٹریز میں اچھے عہدے پر فائز تھا اس لیے بنک لون وغیرہ کا انتظام کروانے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کسی خودرو جنگلی پودے کو بھی اگر ڈھنگ سے تراش خراش کر گملے میں سجالیا جائے تو وہ بھی سندر لگنے لگتا ہے۔ گوپا آنٹی کا آتم وشواس بھی دھیرے دھیرے بڑھنے لگا۔ اور دوکان چل نکلی۔ ہر صبح اجے انکل خود ہی اسکوٹر پر گوپا کو ہوٹل کے پاس چھوڑ جاتا اور پھر شام ہوتے ہی واپس لے آتا۔ پھول پودوں سے رغبت کی وجہ سے گوپا نے اپنے فلیٹ کے سامنے چار گز کی زمین کو سورگ بنایا تھا۔ مختلف اقسام کے رنگ برنگے پیڑ پودے اُگائے تھے۔ سیمنٹ شدہ جگہوں پر طرح طرح کے گملے سجائے تھے جن میں جاپانی اسٹائل کے بون سائی پیڑ اُگ رہے تھے۔ ڈرائنگ روم اور ورنڈا میں بھی طشتری نما گملے رسیوں کی مدد سے لٹکا دیئے تھے جن سے بیلوں کی شاخیں محبوب کی زلفوں کی مانند لٹک رہی تھیں۔

گوپا آنٹی کے ٹیلنٹ اور اُس کی لگن کو دیکھ کر نتاشا بہت متاثر ہوئی۔ اُس نے بھی فلور اور انٹیریئر ڈیکوریشن کا ڈپلومہ حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ نتاشا چاہتی تھی کہ وہ بھی اپنے فلیٹ کو ایسا ہی خوبصورت بنالے مگر ان ملٹی اسٹوری فلیٹوں کی سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ گراونڈ فلور کے سوا باقی سبھی فلیٹوں میں دو گز چوڑی بالکونی کے بغیر اور کوئی بھی جگہ خالی نہیں ہوتی۔ پریشانی یہ تھی کہ اس بالکونی میں گملے رکھے جائیں یا کپڑے سکھائے جائیں۔ اسکول میں ہائجین کے استاد کا اصرار تھا کہ رہائشی مکان کھلا اور ہوادار ہونا چاہیے۔ آگے پیچھے صحن یا باغیچہ ہونا چاہیے جہاں پر پیڑ پودے اُگائے جاسکیں تا کہ صاف ستھری اور صحت بخش ہوا مل سکے۔ کھیلنے کودنے اور کسرت کرنے کے لیے ایسے کھلے صحن کا ہونا بہت ہی ضروری ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا تھا۔ یہ نئی تہذیب کے نئے طرز کے سلمز تھے۔ نہ صحن تھا، نہ کھیلنے کا میدان تھا اور نہ ہی کھلی ہوا تھی۔ جو کچھ تھا بس یہ چھوٹا سا فلیٹ جس کی اگلی کھڑکیوں

میں سے دن رات گاڑیوں سے نکلا ہوا بدبودار دھواں داخل ہوتا اور پچھلی کھڑکیوں سے وہ سڑاند کے بھبھکے چلے آتے جو کچرے کے سڑنے سے پیدا ہوتے۔ یہ کچرا کچن اور باتھ روم کی ٹوٹی ہوئی پائپوں سے گندے پانی کے ساتھ بہہ کر نیچے جمع ہو جاتا تھا۔

رہی بات کھیلنے کودنے کی۔ اُس کے لیے گورنمنٹ نے تارا سینما کے بغل میں ایک کھلا وسیع میدان چھوڑ رکھا تھا جس کا آدھے سے زیادہ حصہ تو کالونی کا کچرا اور ملبہ ڈالنے کے لیے استعمال ہو رہا تھا اور باقی آدھے حصے پر علاقے کے غنڈوں اور بدمعاشوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ کالونی کا کوئی بھی شریف تہذیب یافتہ لڑکا وہاں پھٹکنے کی جرأت نہیں کرتا۔ لڑکیوں کی تو بات ہی نہیں۔ نتاشا اور اُس کے پتا جی نے اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔ نتاشا نے باڑی سِلمر اور ہیرو کی ورزش سائیکل خرید لی تھی اور نتاشا کے پتا جی، اشوک پٹیل، نے بُل ورکر خریدا تھا۔ ماں کو نگوڑی رسوئی سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ وہ ان باتوں کی طرف دھیان دیتی۔

نتاشا جب بھی اپنی نانی کے بارے میں سوچا کرتی اُس کے دماغ میں بھولی بسری یادیں سمٹ کر چلی آتیں۔ نانی تو خیر اب اس دنیا میں نہیں تھی تاہم اُس کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک پل اُسے یاد تھا۔ بچپن میں جونہی نانی گھر میں قدم رکھتی نتاشا اُس کی پوٹلی پر برق رفتاری سے ٹوٹ پڑتی۔ اُسے معلوم تھا کہ کچھ نہیں تو ڈھیر ساری ریوڑیاں تو کھانے کو ملیں گی۔ ریوڑیوں کے علاوہ وہاں بتاشے، پٹیاں اور آم پاپڑ ٹھسے رہتے۔ نتاشا ان چیزوں پر ایسے جھپٹتی جیسے برسوں کی بھوکی ہو۔ بعد میں جب نتاشا نے سینٹ میری کانونٹ میں داخلہ لیا اس کو نانی کے آم پاپڑ، پٹیاں، ریوڑیاں اور بتاشے سب کچھ کھلنے لگے تھے۔ وہ ان سب چیزوں کو غیر مہذب لوگوں سے منسوب کرنے لگی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب نانی بھی غیر مہذب لگنے لگی تھی حالاں کہ اُس کی لچھے دار باتوں کے لیے ابھی بھی کان ترستے تھے۔

ایک دفعہ جب نانی گھر آئی تھی ممی کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ ممی اور پتا جی کے بیچ میں کسی بات

پر تیکھی نوک جھونک ہو چکی تھی۔ غصے میں آکر پاپا نے ممی کو برا بھلا کہا تھا۔ ''گنواروں میں پلی ہو، گنوار ہی رہو گی۔ وہاں میکے میں تھا ہی کون جو تمہیں اٹھنے بیٹھنے کی تمیز سکھاتا۔ ان کلچرڈ لیڈی!''

نتاشا کو تعجب ہو رہا تھا کہ اس کے پتا جی ایسے کوسنے کیوں دے رہے تھے۔ خود اُن کے پاس تھا ہی کیا جس کے دم پر وہ ممی کو نیچا دکھا رہے تھے۔ گورنمنٹ سے کرائے پر لیا ہوا ایک بوسیدہ فلیٹ جس میں ایک ڈرائنگ کم ڈائننگ روم تھا، دو بیڈروم تھے اور ایک چھوٹا سا کچن۔ پھر کس بات پر وہ اپنی چھاتی پُھلائے جا رہے تھے۔ جب کہ ممی کے مائکے میں نانا جی کی بہت بڑی حویلی تھی۔ گنے تو نہیں تھے پر کم سے کم بیس چھوٹے بڑے کمرے تھے۔ حویلی کے ارد گرد دس ایکٹر زمین تھی جس میں قلمی آموں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ نتاشا جب بھی ماں کے ہمراہ وہاں جایا کرتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی جیل سے چھٹکارا مل چکا ہو۔

نانی کے سامنے ممی نے ساری کہانی دُہرائی تھی مگر نانی نے ان سنی کر دی۔ وہ ممی کو پتا جی کے خلاف بھڑکانا نہیں چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔ ''پتی پرمیشور ہوتا ہے بیٹی۔ اس کی باتوں کا ملال کیسا۔ ویسے بھی مرد لوگ ایسی باتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ سن کر بات ٹال دیا کرو''۔ نتاشا نے سنا تھا کہ نانی اپنی بیٹی سے اُس وقت بہت ناراض ہوئی تھی جب ممی نے اُس کے پیدا ہونے کے بعد آپریشن کروایا تھا۔ نانی نے بہت سمجھایا تھا۔ ''ارے تم نہیں سمجھتی۔ لڑکا گھر کا چراغ ہوتا ہے۔ نتاشا کا کیا بھروسا۔ وہ تو آج یہاں ہے کل کہیں اور ہوگی۔ پرایا دھن ہے۔ چلی جائے گی۔ اس وقت پہاڑ جیسا بڑھاپا تمہارے سامنے ہوگا۔ تم کسی بھی طرح ان کو منالو۔ اس چکر میں ابھی نہ پڑو''۔

''اماں، تم نہیں سمجھو گی۔ وہ تو اس بات پر مُصر ہیں کہ دوسرا بچہ نہیں چاہیے۔ آئے دن ریڈیو، ٹی وی پر جو ایڈس آتے ہیں نا۔ ایک بچہ بس........! بھلا پھر میں ان کو کیسے منا سکوں گی''۔ ماں نے اپنی صفائی پیش کی تھی۔

''کیا زمانہ آ گیا'' نانی بول پڑی تھی۔ ''ایک ہمارا وقت تھا۔ سات، آٹھ، نو، دس.....
رکنے کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ معلوم ہے گھر بچوں کے بغیر سونا سونا لگتا ہے۔ کتنا مزہ آتا تھا
جب حویلی میں سب بچے کھیلتے کودتے اور شوروغل مچاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں آم
کے پیڑ پر چڑھی تھی۔ پیر پھسل گیا اور میں دھڑام سے گر گئی۔ ہڈی پسلی ٹوٹ گئی۔ دونوں
ٹانگیں سوج گئیں۔ گھر میں چھوٹے بھائی کے سوا اور کوئی بھی نہ تھا۔ وہ دوڑ کر سبھی بھائی بہنوں
کو اکٹھا کر لایا۔ پھر بے چارہ ویدجی کے پاس چلا گیا۔ ویدجی آئے۔ اس نے ٹانگوں میں
مالش کی۔ اور کئی جڑی بوٹیوں کے نام گنوائے۔ دوائی بنانے کا طریقہ منجھلی دیدی کو سمجھایا۔
دوسرا بھائی بازار سے جڑی بوٹیاں خرید لایا۔ دیدی نے دیگ چڑھائی اور جڑی بوٹیوں
کو ابالنے لگی۔ جب لیپ جیسی بنی تو کپڑے میں رکھ کر ٹانگوں پر پٹیاں باندھ دیں۔ بڑی
دیدی پرانوں اور جاتکوں کی.......اور بھی نہ جانے کہاں کہاں کی......کہانیاں سناتی رہی۔
ایسے ہی پورا ہفتہ گزر گیا اور میں صحت یاب ہو گئی۔ وقت کیسے کٹا اس کا احساس بھی نہ ہوا۔
بوڑھے ماں باپ تو بس سرہانے بیٹھے بھگوان سے پرارتھنا کرتے رہے۔ تب نہ یہ ڈاکٹر تھے
اور نہ ہی یہ نرسیں۔ سب کچھ اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ ویدجی بھی اپنے لگتے تھے۔ آج انگلی میں بھی
سوئی چبھ جائے تو ہسپتال میں داخلہ لینا پڑتا ہے۔ ناک بھوں چڑھاتی ہوئیں بددماغ نرسیں
دیکھ بھال کرتی ہیں۔ لالچی ڈاکٹر دن رات طواف کرتے رہتے ہیں اور سگے سمبندھیوں
کو تو ملنے کی اجازت بھی نہیں ملتی۔

نتاشا پر ان باتوں کی صداقت کئی سالوں کے بعد عیاں ہو گئی۔ وہ جونہی سوچنے سمجھنے
کے قابل ہوئی اُسے اپنے اکیلے پن کا احساس کچوکنے لگا۔ دوسری طرف اس کی ماں بھی کسی
انجانے خوف اور عدم تحفظ کے احساس میں گھر گئیں۔ نتاشا چاہتی تھی کہ اپنے پتاجی
کا گریباں پکڑ کر ان سے پوچھ لے۔ ''آپ کو مجھے اکیلا رکھنے کا حق کس نے دے دیا۔
کیا مجھے بہن بھائیوں کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا مجھے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے کھیلنے
اور ان کے غم و خوشی میں شریک ہونے کا ادھیکار نہیں ہے۔ پھر کیوں......؟'' سوچتے سوچتے

اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ ''آخر سیزر میرا بھائی تو نہیں بن سکتا۔ نسل کا کتا ہی ٹھہرا۔ وہ کتنا ہی وفادار کیوں نہ ہو۔ بہن یا بھائی نہیں بن سکتا۔''

اکیلے پن کا شدید احساس نتاشا کو تب ہوا جب اس کے پتا جی ڈیپوٹیشن پر تنزانیہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ایک کے بعد ایک کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جانے سے پہلے پتا جی کہا کرتے تھے۔ ''نتاشا بیٹی، میں یوں گیا اور یوں لوٹ آیا۔ دو سال کی ہی تو بات ہے۔ ممی کا خیال رکھنا۔ اپنی پڑھائی کا بھی خیال رکھنا۔ آئی وانٹ یو ٹو گیٹ ڈسٹنکشن ایوری ٹائم''۔

پھر ماں بیٹی دونوں نے اشوک پٹیل کو اندرا گاندھی انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر الوداع کی تھی۔ پہلے پہل ہفتے میں ایک دو خط موصول ہوتے۔ بعد میں مہینے میں ایک یا دو خط آنے لگے اور آخر کار خطوط کا سلسلہ ہی بند ہو گیا۔ ممی کی پیشانی پر فکر و تردد کی شکنیں نمودار ہونے لگیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ چہرے کی رنگت بھی فق ہونے لگی۔ بڑھتی ہوئی مالی پریشانیوں نے ممی کو جسا والا کے شوروم میں سیلز وومن کا کام کرنے پر مجبور کیا۔ گھر میں نہ وہ پہلے سا ٹھاٹ باٹ رہا اور نہ ہی وہ سکون۔

ماں نے نتاشا کو شملہ میں بورڈنگ اسکول میں ڈال دیا جہاں وہ اجنبیوں کی بھیڑ میں اور بھی فکرمند رہنے لگی۔ ممی سے تو خیر دیر سویر ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر پتا جی کی کوئی خیر و خبر نہ تھی۔ ماں نے بہت کوشش کی کہ نتاشا پر اپنی پریشانیاں ظاہر نہ ہونے دے۔ البتہ پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب نتاشا گھر آئی تھی اُسی دوران ایس ٹیٹ آفس سے مکان خالی کرنے کا نوٹس بھی مل گیا اور ممی متبادل انتظام کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرتی رہی۔ اس کے باوجود ممی نے پاپا کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہا۔ نتاشا اس راز سے بالکل بے خبر رہی کہ اُس کے ماں باپ باہمی رضامندی سے الگ ہو چکے ہیں اور یہ علیحدگی ان سب تبدیلیوں کا پیش خیمہ تھی۔ امتحانات ختم ہوتے ہی نتاشا دوڑتی بھاگتی اپنی ماں کے پاس چلی آئی۔ چند ہی سالوں میں اس کی ماں پر خزاں چھا گئی تھی۔ سفید بال، چہرے پر جھریوں کا جال اور

آنکھوں پر موٹا چشمہ چڑھ گیا تھا۔

کل رات ممی اور نتاشا دونوں جساوالا کے گھر پر مدعو تھے۔ جساوالا اپنے اکلوتے بیٹے کا جنم دن منا رہا تھا۔ زندگی سے اُکتائی ہوئی دوروحیں اتنی ساری بھیڑ میں وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں سمٹ کر اپنا وجود کھو بیٹھی تھیں۔ دریں اثنا سامنے دروازے سے ایک جانا پہچانا آدمی کسی تیس پینتس سالہ عورت کی کمر میں اپنے بازو حمائل کئے ہوئے چلا آیا اور پھر بھیڑ میں گم ہو گیا۔ نتاشا اس کو دیکھتے ہی تلملا اٹھی۔ وہ بہت دیر تک جل بن مچھلی کی طرح صوفے پر تڑپتی رہی۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا۔ ہمت بٹور کر وہ کھڑی ہوئی اور بھیڑ کو چیرتی ہوئی دبے قدموں سے اس آدمی کا پیچھا کرنے لگی۔ اُس آدمی کا دھیان اپنی طرف مبذول کرنے کی خاطر نتاشا نے پیچھے سے اُس کے کوٹ کے دامن کو کھینچ لیا اور ساتھ ہی رندھی ہوئی آواز میں چلائی۔ ''پا...... پا!''

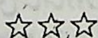
وہ آدمی مڑا مگر ضبط کر کے خاموشی سے اس نے نتاشا کو پہچاننے سے انکار کیا۔ دیکھتا رہا۔

ممی دوڑ کر نتاشا کے قریب پہنچی اور اس کے بازو کو جھٹک کر اس آدمی کا دامن چھڑا دیا۔ وہ نتاشا کو ڈانٹنے لگی۔ ''ڈونٹ بھی چائلڈش۔ نتاشا! ہی از یوَر انکل! ناٹ یوَر پاپا۔ وہائی ڈونٹ یو انڈرسٹینڈ''۔

ممی اور اُس آدمی کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور پھر فرش پر بکھر گئیں۔ ممی کی نظریں لوٹ کر اُس اجنبی عورت کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں جو اس آدمی کے ہمراہ تھی۔ وہ بہت ہی پشیماں تھی۔ بڑی ندامت سے وہ اجنبی عورت سے مخاطب ہوئی۔

''آئی ایم سوری میڈم۔ شی از سٹل اے چائلڈ۔ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پائی۔''

اور پارٹی کے اختتام تک اُس آدمی کی نظریں نتاشا، ممی اور اُس عورت کے درمیان جھولتی رہیں۔



خودکشی

''خودکشی انسان کا پیدائشی حق ہے۔'' میری آواز ہال میں کئی بار گونجی تھی۔ اور سامعین نے میرے دلائل کو تہہ دل سے سراہا تھا۔

ڈبیٹ تو کب کا ختم ہو چکا تھا مگر تالیوں کی گونج اب بھی میرا تعاقب کر رہی تھی۔ ذہن میں دفعتاً ایک ہی سوال اُبھر رہا تھا۔

''ججوں نے مجھے انعام کا حقدار کیوں نہیں سمجھا جب کہ میں ہی ایسا واحد شخص تھا جس کے لکچر کے دوران سارا ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے کئی بار گونجا تھا؟''

رات بھر کی بوندا باندی سے ہوا میں اُمس اور گھٹن سی پیدا ہوئی تھی۔ آسمان پر کالے بادل مست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ شاید موسم بھی میرے ساتھ ہمدردی جتا رہا تھا۔

''میں بھی کیسا پاگل ہوں۔ میری ہار یا جیت سے کسی کو کیا واسطہ؟ میری ناکامی تو میری اپنی ہے، دنیا کو اس کے ساتھ کیا غرض''۔

میری سائیکل کے پہیئے بار بار کیچڑ میں دھنس رہے تھے۔ اور میں مسلسل ان کو کیچڑ سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پتلون کے پائنچوں میں چھینٹوں کی گل کاری ہو رہی تھی۔

''آپ اتنے مغموم کیوں ہیں؟ سچ پوچھئے تو انعام کے حق دار آپ ہی تھے۔ ان منصفوں کا کیا بھروسا؟ یہ لوگ تو ہر مسئلے کو اپنے تجربے کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے ایک انسان دوسرے انسان کے فکر و فن کا منصف کیسے بن سکتا ہے جب کہ دونوں الگ الگ ماحول میں پلے بڑھے ہوتے ہیں۔ دونوں کی سوچ مختلف ہوتی ہے۔ اور دونوں

یہ کہانی پہلی بار 'سلمیٰ' کے عنوان سے اخبار ہمدرد سرینگر میں 1970 میں چھپی تھی۔

کے تجربے الگ ہوتے ہیں۔''

سلمیٰ مجھے دلاسہ دے رہی تھی۔ وہ مجھ سے پہلے ہی تھری وہیلر میں گھر پہنچ چکی تھی۔ ہمدردی کے بول زخموں پر پھاہے کا کام کر رہے تھے۔ سلمیٰ اسی کالج میں بی ایڈ کی اسٹوڈنٹ تھی جہاں میں ایم ایڈ کی تعلیم پا رہا تھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد اُس نے ایک گورنمنٹ اسکول میں ملازمت شروع کی تھی۔ اِدھر نوکری ملی اُدھر ماں نے ہاتھ پیلے کر دیئے۔ ماں کے پاس اور بھی تو کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو مرد جوانی میں جونک کی طرح چمٹا رہا وہ پرائی عورت کے ساتھ رفو چکر ہوا تھا۔

ماں نے سلمیٰ کے لیے سن رسیدہ بَر اس لیے ڈھونڈا تھا تاکہ دونوں کو ایک ہی چھت کے نیچے پناہ ملے۔ سلمان صاحب تھے کہ دو بیویوں کو پہلے ہی مٹی دے چکے تھے۔ پھر رضامند کیوں نہیں ہوتے۔ بچوں کی کلکاریوں کے لیے اب بھی اُن کے کان ترس رہے تھے۔ ماں کے دودھ کا قرض اتارنے کے لیے بیٹی کی یہ قربانی کچھ زیادہ نہ تھی۔ آخرکار سلمیٰ دلہن بن کر سلمان صاحب کے گھر میں باسی شہنایوں کے ساتھ داخل ہوئی۔ مگر کاتب تقدیر نے کچھ اور ہی ٹھان لی تھی۔ ماں کو تپدق نے آدبوچا اور شادی کے چند ہی مہینوں بعد وہ داغ مفارقت دے گئی۔

باقی رہے سلمیٰ اور اس کا بوڑھا شوہر۔ اور سامنے دیوار پر لٹک رہی بوسیدہ ولائتی کلاک جس کا پنڈولم پچھلے پچاس سال سے دو منتہاوں کے درمیان ایک ہی رفتار سے جھول رہا تھا۔

نقاہت......! موتیابند......! اور پھر سیڑھیوں سے گر کر دونوں ٹانگوں کا ٹوٹ جانا....! غرض یہ کہ سلمان رشید کے سر پر آفتوں کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا اور لاچار سلمیٰ دیکھتی رہ گئی۔ ایسے اپاہج کو کھلانا پلانا، نہلانا دھلانا اور خاص کر اُس کا مل موتر اُٹھانا جانکاہی کا کام تھا جسے سلمیٰ چپ چاپ بڑی خوبی کے ساتھ نبھا رہی تھی لیکن منہ سے کبھی اُف تک نہ نکلی۔ گھر بھی خالی ہوتا گیا۔ کپڑے لتے، زیور گہنے، برتن فرنیچر جو کچھ تھا سب بک گیا۔ صرف ایک امید تھی اور خدا پر بھروسا تھا جو اُسے مایوس ہونے نہیں دیتا۔ حکومت نے سلمیٰ کو بی

ایڈ ان سروس کورس کے لیے منتخب کیا۔ اس کی جان میں جان آئی۔ ترقی کے امکانات نے اُس میں ایک نئی روح پھونک دی۔

سلمٰی کے ساتھ میری واقفیت اچانک لائبریری میں ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں میں نے اس کے چہرے پر بُنے ہوئے درد کے جال کو پہچان لیا تھا۔ میں نے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا اور ساتھ ہی اس کو امتحان میں تیاری کروانے کی پیش کش بھی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اس نے بھی اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

پہلے پہل تو میں کالج میں ہی اس کو ٹیوشن دیتا رہا اور پھر اُس کے گھر بھی جانے لگا۔

وہ بڑی لگن سے اپنی پڑھائی کرتی رہی۔ پڑھائی کے دوران بغل والے کمرے سے مسلسل کھانسنے اور کراہنے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ کئی بار اُٹھ کر اندر کمرے میں چلی جاتی اور پھر کچھ ہی ساعتوں میں لوٹ آتی۔ میں نے کبھی اُس کمرے میں جانے یا جھانکنے کی جسارت نہیں کی اور نہ ہی سلمٰی سے اس بارے میں کبھی کوئی گفتگو کی۔ میں اُس کے جذبات کی قدر کرتا تھا۔

اُس روز ڈبیٹ سے واپس آ کر شاید سلمٰی میرے دل کی کیفیت بھانپ گئی تھی۔ وہ خود زندگی میں شکست وریخت سے سمجھوتہ کر چکی تھی مگر میں! میں تو پہلی بار شکست کا سامنا کر رہا تھا جس کی خراش سے میں تلملا رہا تھا۔ جب دو دِلوں کی کیفیت ایک جیسی ہو تو ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کا جاگنا قدرتی عمل ہے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے تولیہ سے میرے پانچوں کے دھبے پونچھ لئے۔ اور پھر گرم چائے بنا کر لے آئی۔

''آپ نے تو آج کمال کر دیا۔ سبھی سامعین آپ کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔'' اُس نے پھر اپنے جملے دھرائے۔

''ان کی تعریفوں اور تالیوں سے کیا ہوتا ہے۔ آخر جو جیتا وہی سکندر۔'' میں نے چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں، میں ایسا نہیں مانتی۔ تاریخ گواہ ہے۔ جب بھی کوئی شخص نئے افکار و خیالات دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ دنیا اس سے سنگسار کرتی آئی ہے۔ خدا کا شکر کیجئے۔ آپ پر پھول تو نہیں برسائے گئے مگر سنگ بھی تو نہیں پھینکے گئے"۔ سلمیٰ میری ڈھارس بندھا رہی تھی۔ اس کی دلیل نے مجھے قائل کر دیا تھا۔ اس کی نظروں میں شفقت تھی اور لہجے میں خلوص۔

"میرے لیکچر میں ایسی کوئی بھی بات نہیں تھی جس کی وجہ سے کسی کے عقیدے کو ٹھیس لگی ہو۔ پھر کیوں......؟" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہ آپ سوچتے ہیں کیونکہ آپ کا دل آئینے کی طرح صاف وشفاف ہے۔ مگر ان کو کون سمجھائے جن کے دلوں پر مذہبی روائت پسندی اور اخلاقی حد بندی نے اپنی اِمٹ چھاپ ڈال دی ہو۔ یہ وہی لوگ ہیں جو غریبوں کے پسینے سے اپنی عمارتیں بلند کرتے ہیں۔ فاقہ زدہ یتیم بچوں کو تا عمر اپنے راچھوں کے ساتھ لٹکا کر منڈیوں کو قالین سپلائی کرتے ہیں۔ مفلس دہقانوں کے خون کی سیاہی بنا کر اپنے بہی کھاتے لکھتے ہیں۔ اور باہر دکھاوے کے لیے زکوٰۃ میں بڑی بڑی رقوم بانٹتے پھرتے ہیں۔ اپنے نام کی تختیاں ہر اُس جگہ نسب کرواتے ہیں جہاں سے اُن کو نیک نامی اور شہرت کی امید ہوتی ہے۔ اگر آپ ان لوگوں کا بائیوڈاٹا دیکھیں گے جو اُس وقت منصفوں کی کرسیوں پر براجمان تھے آپ کو خود ہی اندازہ ہوگا کہ وہ آپ کے خیالات سے کیوں متفق نہیں ہو سکے۔

اُس روز سلمیٰ کی خوشبوئیں میرے روم روم میں سما گئی تھیں۔ اس دن کے بعد جب بھی میں اس کو پڑھاتا مجھے وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ علم کی ساری پونجی، جو میں نے عمر بھر جمع کی تھی، اُس کو سلمیٰ کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ صبر و تحمل سے سنتی رہتی۔ یا پھر وقتاً فوقتاً اپنی کاپی میں نوٹ کرتی رہتی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں صرف بولتا رہوں اور وہ سنتی رہے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔

بغل والے کمرے سے آرہی کھانسنے اور کراہنے کی آوازیں اب الجھنیں پیدا کرنے لگی تھیں۔

اپریل کے مہینے میں امتحانات منعقد ہوئے۔ پہلے پریکٹس آف ٹیچنگ اور پھر تھیوری۔ میں اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر اُس کے ہمراہ امتحان ہال تک چلا جاتا اور اس وقت تک انتظار کرتا جب تک وہ باہر نہ آتی۔ جولائی میں نتائج کا اعلان ہوا۔ میں دوڑتا بھاگتا مٹھائی کا ڈبہ لے کر اُس کے گھر پہنچا۔

''مبارک ہو سلمٰی۔ یُو گاٹ ڈسٹنکشن۔ اب تو ٹریٹ ڈیو ہے''۔

اس کا چہرہ پہلے کی طرح ہی سنجیدہ اور غمگین تھا۔

''شکریہ ......! اچھا ہوتا اگر میں ناکام ہی رہتی۔ کم سے کم آپ یہاں آنا تو نہ چھوڑتے۔ امتحان کے بعد ایک بار بھی آپ نے اپنی صورت نہیں دکھائی۔ سلمٰی زندہ ہے یا مر گئی۔ آپ کو کیا؟''

جواباً میں کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا مگر الفاظ میرے حلق ہی میں اٹک گئے۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے سلمٰی کا خیال نہیں آیا تھا لیکن مجھے بنا کسی مقصد کے اُس کے گھر جانا معیوب سا لگ رہا تھا۔

وہ مٹھائی کا ڈبہ لے کر سیدھے اندر والے کمرے میں چلی گئی اور کچھ وقفے کے بعد کھلے ہوئے ڈبے کو ہاتھ میں لیے واپس نکل آئی۔ مٹھائی کا ڈبہ میری طرف بڑھا کر وہ گویا ہوئی۔

''آپ بھی تھوڑی سی کھا لیجیے۔ اس کامیابی کا سہرا تو آپ ہی کے سر ہے۔ میں تو بس ایک سنگ تراش کی چھینی ہوں''۔

اس سے پہلے کہ میں مٹھائی اٹھاتا۔ سلمٰی نے خود ہی ایک لڈو اُٹھا کر میرے منہ میں ٹھونس دیا۔

''یہ میری اور سے'' اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اُس کی اس بے تکلفی سے میں حیراں ہوا۔

''آپ کو اندر انہوں نے یاد کیا ہے!''

میں اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔

"چلئے۔آپ پہلے چلئے۔" میں سلمیٰ کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

میرے سامنے ایک معذور و ناتواں لاغر آدمی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

کھانسی.......! کراہنے کی آواز........! سانسوں کا اُتار چڑھاؤ........!

ایک پنجر.......! ایک معمہ...........!

"یہ میرے سرتاج ہیں۔ سلمان رشید.......!" سلمیٰ اپنے خاوند کا تعارف کراتے ہوئے مجھے گھورنے لگی۔اس کی آنکھوں میں رنج والم کا طوفاں مچل رہا تھا۔

"آداب!" میں نے اُن ملتجی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کمرے میں بیماری، سڑانداور عفونت کی دبیز تہیں جمی ہوئی تھیں۔اس کریہہ اور جاں سوز منظر کو میں برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔میں نے کبھی ایسے منظر کا قیاس بھی نہیں کیا تھا۔

"سلمیٰ۔تم نے مجھ سے یہ بات آج تک کیوں چھپا کر رکھی۔ان کی ایسی حالت ہے اور تم اکیلی اسے جوجھتی رہی" میری آواز میں خفگی صاف عیاں تھی۔

"بے چاری کیا بتائے گی۔ یہ تو میری کرنی کا پھل بھگت رہی ہے۔ ورنہ اس کا بھی ایک خوشحال گھر ہوتا۔ بال بچے ہوتے۔ایسی حالت زار تو نہ ہوتی۔ یہ آپ کی مہربانی ہے کہ بے چاری کو کچھ سہارا مل گیا۔"

اس روز کے بعد اُس گھر میں میرا آنا جانا معمول بن گیا۔اب میں روزمرہ کے کاموں میں بھی سلمیٰ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ بازار سے سودا سلف لانا، ڈاکٹروں سے مشورہ لینا یا پھر دوائیاں خرید کر لانا میں نے اپنے ذمہ لے لیا اور سلمیٰ پھر سے اپنے کاموں میں جٹ گئی۔

ایک مرتبہ میں سلمیٰ کی غیر حاضری میں سلمان رشید سے ملا۔ باتوں باتوں میں اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ گھبرائی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"آپ سے میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔امید ہے آپ خفا نہیں ہوں گے"۔

''کہیے۔ مجھ سے جو بھی ممکن ہو سکے گا کروں گا''۔

''میں اپنی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ میں سلمٰی پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ کیا آپ میری مدد کر سکیں گے''۔

''کس طرح کی مدد؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے دس پندرہ خواب آور گولیاں لا کر دیجئے۔ میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں''۔

میں سکتے میں آ گیا۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سلمان رشید نے ایسی گھناونی اسکیم سرانجام دینے کے لیے مجھے ساجھی دار بنانے کا انتخاب کیوں کیا۔

''خودکشی...! یہ تو گناہ ہے۔ آپ ایسا کیوں کر سوچنے لگے'' میں نے ہمت بٹور کر جواب دیا۔ اور خود فکر و تردّد کے عالم میں غرق ہو گیا۔ سلمان صاحب کی حالت کو دیکھ کر مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ اور من ہی من میں سوچنے لگا۔

''اس میں گناہ ہی کیا ہے۔ اس حالت سے تو کہیں بہتر ہے کہ وہ خودکشی کر کے اپنی جان چھڑا لیں۔ ایسے کئی ممالک ہیں جہاں مخلصی موت جائز ٹھہرائی جاتی ہے۔ میں اُن سے خودکشی کرنے کا حق کیوں چھین رہا ہوں۔ میں اسکو اس جہنم سے ضرور نجات دلا دوں گا۔

میں اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ سلمان رشید کو نیند کی گولیاں خرید کر دوں گا مگر اگلے ہی لمحے میں ٹھٹکا۔

''نیند کی گولیاں.....؟ زہر........؟ کیا تم نے سلمٰی سے پوچھا ہے؟ کیا وہ سلمان رشید کا قتل گوارا کرے گی؟ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کارروائی میں میری خودغرضی کو دخل ہے؟ ....نہیں نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے''۔

میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ اور دوسرے ہی دن آ کر سلمان رشید کو ہمت اور حوصلے سے زندگی کا سامنا کرنے کی تلقین کرنے لگا۔

سلمان رشید میری باتیں غور سے سنتے رہے۔

''ٹھیک ہے میں آخری لمحے تک اپنی یہ زندہ لاش اٹھائے پھروں گا''۔

اتنے میں سلمیٰ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی اور بغل میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟'' سلمان رشید کچھ وقفے کے بعد گویا ہوئے۔

''ضرور پوچھئے''۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میری عمر پچپن سال کی ہے۔ اور سلمیٰ صرف تیس سال کی ہے۔ میری وجہ سے اس کی زندگی میں گرہن لگ چکا ہے۔ زندگی بھر میں نے اس کے منہ سے کبھی کسی کی تعریف نہیں سنی سوائے آپ کے۔ کیا آپ سلمیٰ کا ہاتھ تھام سکتے ہیں؟''

میں حیرت زدہ نگاہوں سے دونوں کو دیکھتا رہا۔

سلمیٰ اس غیر متوقع سوال کی تاب نہ لا کر اُٹھ کر کمرے سے بھاگ گئی۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ نہ ہاں کر سکا نہ ہی نا۔ وہ پنجر مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

''سلمیٰ کو اپنانے میں برائی بھی کیا ہے۔ وہ آپ کو چاہتی ہے اور شاید آپ بھی.... آپ چاہیں تو مجھے بھی سہارا دے سکتے ہیں یا پھر چاہیں تو مجھے کسی خیراتی اولڈ ہوم میں داخل کروا دیں۔

میرے سوچنے کی طاقت مفلوج ہو گئی۔ میں کچھ بھی طے نہیں کر پایا۔ جواب دیئے بغیر ہی وہاں سے چل پڑا۔

دو روز کے بعد شام کے پانچ بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو''

''میں سلمیٰ بول رہی ہوں۔ آپ جلدی سے یہاں چلے آیئے''۔ ٹیلی فون پر سلمیٰ کی ہچکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''آخر کیا بات ہے۔ تم کیوں رو رہی ہو؟''

''میں عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ سلمان صاحب نے میری عدم موجودگی میں شیونگ بلیڈ سے اپنی کلائی کی نس کاٹ لی ہے۔ ساری مسہری خون سے لت پت ہے۔ میں یہاں پر اکیلی ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''سلمیٰ تم گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے اس کو ڈھارس دی۔

جلدی جلدی میں نیچے اترا۔ گیٹ کے سامنے ایک ٹیکسی روکی اور سیدھے سلمیٰ کے گھر پہنچا۔

اسی متعفن کمرے میں مسہری پر وہ پنجر ٹھنڈا پڑ چکا تھا جو کبھی میرے لیے معمہ بنا ہوا تھا۔

میرے کانوں میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

''آپ مجھ سے خودکشی کا حق نہیں چھین سکتے!''

☆☆☆

ایک ہی خط

وارڈ نمبر ۱۳، کملا اسٹیٹ اسپتال، بریلی

۲۵ر ستمبر ۱۹۹۶ء

سنجو! میرے پیارے سنجو!

سوچتے ہو گے کیسی بے مروت لڑکی ہے۔ کسی خط کا جواب بھی نہیں دیتی۔ سچ تو یہ ہے سنجو کہ تمہارے کئی خط ملے مگر کیا کرتی جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے؟ ایک پہاڑ جو سر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ گو سب سے پہلے میں تم کو ہی اطلاع دینا چاہتی تھی پر دل نے نہیں مانا۔ خبر سن کر تم گھبرا نہ جاتے! پھر تمہارا من پڑھائی میں کیسے لگتا؟ ڈاکٹری پڑھنے گئے ہو، کوئی معمولی ڈگری حاصل کرنے تھوڑے ہی گئے ہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم ایک دن بہت بڑے ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ یہی سپنے میں روز و شب دیکھتی ہوں۔ تم نے کس طرح غربت و افلاس میں رات دن ایک کئے، کتنی راتوں کو جاگ جاگ کر تم نے کاتبِ تقدیر سے اپنی قسمت لکھوائی، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ پھر میں ان سپنوں کو کیسے ٹوٹنے دیتی۔ یاد ہے جب تمہارے داخلے کا تار ملا تھا تو ہم خوشی سے پاگل ہو گئے تھے۔ کتنے مندروں میں چڑھاوا چڑھایا تھا۔ پھر ان خوشیوں پر میں اپنا منحوس سایہ کیوں کر پڑنے دیتی۔

لیکن آج میں مجبور ہوں۔ میں نے ڈاکٹر سے چند سانسیں اُدھار مانگی ہیں۔ کیا معلوم کب اُکھڑ جائیں۔ پھر ایسی صورتحال میں کوئی چارہ بھی تو نہیں۔

سنجو! جولائی میں جب تمہارا پہلا خط آیا تھا۔ میں اُس وقت کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ پوسٹ مین کی آواز سنتے ہی میں نے لپک کر اُس کے ہاتھ سے خط چھین لیا۔ تمہاری

ہینڈ رائٹنگ دیکھتے ہی میں پھولے نہ سمائی۔ فالج زدہ ممی سمجھی شاید پنشن کا منی آرڈر ہے۔ وہ زور سے چلائی۔ ''سروج........! دیکھنا منی آرڈر تو نہیں......؟ میں نے لجاتے ہوئے انکار کیا۔ ''نہیں ممی۔ چٹھی ہے'' وہ بھانپ گئی۔ اس کے پتلے نحیف ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔ بوڑھی نیم وا آنکھوں میں امیدوں کے بے شمار تارے جگمگانے لگے۔ اور میں چپ چاپ کچن میں کھسک گئی۔

کچن کے اندر جاتے ہی میں نے لفافے کو چوما۔ کئی بار چوما۔ پھر کھول کر پڑھنے لگی۔ ایک ایک سطر کئی بار پڑھ لی۔ میرے سنجو کی چھٹی جو تھی۔ اس کے ہر لفظ میں پیار کا ایک بے کراں سمندر چھپا ہوا تھا۔ آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ یہ خوشی بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ بالکل دیوانہ بنا دیتی ہے۔ میں نے بے اختیاری میں کچن شلف کے ساتھ ٹیک لگائی تاکہ خط کو دوبارہ پڑھ سکوں۔ اور پھر یکایک نہ جانے کیا ہوا۔ چاروں طرف شعلے ہی شعلے تھے۔ میری نائلان ساڑی نے آگ پکڑلی اور اُسی آگ نے میرا احاطہ کرلیا۔ میں چلائی۔ زور زور سے چلائی۔ بس چلاتی رہی اور اس کے بعد کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔

آنکھیں کھلیں تو سرکاری اسپتال کا وارڈ نظر آیا۔ اُن دنوں اسپتال میں، جیسا کہ میں نے بعد میں سنا، ڈاکٹروں نے ہڑتال کی تھی۔ ہڑتال جونیئر ڈاکٹروں نے شروع کی تھی۔ پھر سینئر ڈاکٹر بھی شامل ہوگئے تھے۔ باقی ماندہ ملازموں کا کیا تھا۔ وہ تو پیڈ ہولی ڈے منا رہے تھے۔ کوئی حساب لینے والا تھا ہی نہیں۔ اسپتال میں چاروں طرف گندگی پھیل چکی تھی۔ ہر ایک کمرے، ہر ایک بستر سے بدبو آرہی تھی۔ کونوں چھدروں میں مہلک جراثیم ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔ اسی کثیف ماحول میں ہم سب مریض موت سے دست و گریباں تھے۔

میرا ایمرجنسی آپریشن ہوا تھا۔ پورے دس روز میں اُسی غلاظت سے جوجھتی رہی۔ چہرے اور سر پر کہیں کہیں زخم اب بھی موجود تھے مگر اسپتال کے انتظامیہ نے چھٹی اس لیے دی کیوں کہ انہیں مریضوں کی دیکھ بھال میں دقتیں پیش آرہی تھیں۔ ڈاکٹر نے چند ایک

دوائیاں زخموں پر لگانے کے لیے تجویز کیں مگر گھاؤ تھے کہ بھرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اِدھر میں ان پر دوائیاں لگاتی رہی، اُدھر زخموں سے پیپ کی پچکاریاں چھوٹتی رہیں۔ ایک مہینہ ایسے ہی گزرا۔ پھر سے اسپتال میں بھرتی ہونا پڑا۔ جس ڈاکٹر نے آپریشن کیا تھا یہ اُسی کی لاپرواہی تھی کہ زخم اندر ہی اندر سڑتے رہے، پھر رسنے لگے اور آخر کار سارے بدن میں ٹیٹنس کا زہر پھیلتا چلا گیا۔

تمھیں تو یاد ہوگا میں کتنی توہم پرست ہوں۔ اس وارڈ میں آتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ معلوم ہے اس وارڈ کا نمبر کیا ہے؟ تیرہ! ہاں تیرہ! کتنا اشبھ نمبر ہے۔ جونہی میں نے سسٹر سے وارڈ کا نمبر پہلی بار سنا تھا تو میرا دل دھک سے بیٹھ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں یہاں سے کبھی گھر واپس نہیں جاسکوں گی۔

سنجو! تمہاری سروج کا سارا بدن جھلس چکا ہے۔ میرا چہرہ بدنما ہو چکا ہے۔ ویسے بھی میں اپنا بھیانک روپ دیکھ کر اب جینا نہیں چاہتی۔ تمہاری پیاری سروج پر مستقل گرہن لگ چکا ہے۔ تم کہتے تھے نا کہ اس توہم پرستی کی کوئی بنیاد نہیں۔ آؤ، اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ کس قدر سچائی ہے اس میں۔ خود ہی آ کر دیکھ لو کہ اس وارڈ سے اب میری لاش ہی اُٹھ پائے گی۔

آج سویرے ڈاکٹر اور سسٹر کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی اُس کی بھنک میرے کانوں میں پڑی۔ ''سسٹر، ٹیک کیئر، شی از اور گیسٹ فار اے فیو ڈیز اونلی''۔ اس ٹائم سے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میری روح میرے جسم سے اُڑ جانے کے لیے پھڑ پھڑا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مجھ سے رہا نہ گیا۔ چھوٹی بہن رجنی سے کاغذ قلم منگوایا اور یہ خط تحریر کرنے بیٹھ گئی۔ خط کیا لکھ رہی ہوں سارا بدن تپ رہا ہے۔ زبان سوکھ رہی ہے۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ موت کے سائے میری جانب بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ مگر میں پھر بھی لکھ رہی ہوں۔

سنجو، میں تو جا رہی ہوں مگر یاد رکھنا تم میرے خوابوں کی تعبیر ہو۔ میری روح کی تسکین ہو۔ دیکھو میری لاج رکھنا ورنہ میری روح تشنہ بھٹکتی رہے گی۔ ہاں جاتے جاتے ایک وعدہ ضرور لوں گی۔ سنجو! میرے پیارے سنجو! بھگوان کے لیے تم کسی مریض سے کوئی لاپرواہی نہیں

برتنا۔ کسی کی زندگی سے کوئی کھلواڑ نہ کرنا۔ ڈاکٹر مریض کے لیے مسیحا ہوتا ہے۔ اُس مسیحائی سے اپنے آپ کو کبھی نہ گرانا۔ کبھی کسی معصوم کے پیار کی پھانس نہ بننا۔ کبھی دو دلوں کی جدائی کا سبب نہ بننا۔ اسی سے میری روح کو سکوں ملے گا۔ تمہیں میری قسم.......!

ٹھہرو میں اور بھی بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں۔ ہاں، ہاں میں اور بھی کچھ لکھنا چاہتی ہوں.....میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ بدن انگارہ بن چکا ہے۔ ٹھہر.......و.............و..........

دیدی تو یہ خط پورا نہیں کر پائی۔ اس لیے میں اس ادھورے خط کو آپ تک پہنچانے کا فرض نبھا رہی ہوں۔ معلوم ہے دیدی نے زندگی میں پہلی بار کسی کو خط لکھا تھا۔ اور یہی خط اس کی زندگی کا آخری خط بن گیا۔ دیدی جب ہم کو چھوڑ کر چلی گئی تو اس کے لبوں پر ایک ہی نام تھا۔ اور وہ تھا آپ کا..........!

آپ کی چھوٹی بہن

رجنی



کالا گلاب

جب سے فیروز کے کانوں میں بھنک پڑی تھی کہ گلابوں میں سب سے نادر کالا گلاب ہوتا ہے اس کے تجسس کی کوئی حد نہ رہی۔ صبح وشام اس کے ذہن پر یہی دھن سوار رہتی کہ کس طرح کالے گلاب کا دیدار ہو جائے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا کالے گلاب کے بارے میں پوچھتا۔ کہیں بھی، کسی بھی مالی سے بھینٹ ہو جاتی تو سب سے پہلے یہی سوال پوچھتا۔ ''کیا آپ کے باغیچہ میں کالا گلاب اُگتا ہے؟''

''نہیں، میں نے تو صرف سنا ہے، کبھی دیکھا نہیں''۔ ہر ایک سے ٹکا سا جواب ملتا۔

کالے گلاب کی یہ تلاش فیروز کو میرٹھ، چنڈی گڑھ، بنگلور اور دیگر مقامات تک لے گئی۔ کچھ نرسریوں کے مالکوں نے دعویٰ کیا کہ ان کی نرسری میں کالا گلاب اُگتا ہے مگر جانچنے پر معلوم ہوا کہ دراصل وہ اودے یا سرمئی بھورے رنگ کے گلاب تھے، کالے نہیں۔

انڈیا گیٹ کے پاس، جہاں گرمیوں میں رات بھر ہنگامہ رہتا ہے، گیارہ بارہ سال کا ایک لڑکا روزانہ مان سنگھ روڈ اور راج پتھ کے اتصال پر شام کے چھ بجے پھولوں سے لدی ہوئی ٹوکری لے کر بیٹھ جاتا۔ اُس کا باپ قریب ہی ایک بہت بڑے بنگلے میں مالی کا کام کرتا تھا۔ ابتدا میں جب نندو نے گل فروشی شروع کی اس کی ٹوکری میں صرف بیلا اور چمیلی کے پھول ہوتے۔ آہستہ آہستہ پھولوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی اور اقسام بھی۔ چمپا، موتیا، موگرا، بیلا، گیندے، جعفری اور کبھی کبھی ٹیوب روز اور گلے ڈیولا کے پھول بھی نظر آنے لگے۔ دن بھر نندو پڑوس کے سرونٹس کوارٹروں میں رہنے والے دیگر بچوں کے ساتھ لکا چھپی

---

* یہ کہانی گنگ وجمن یار گ سنگ کانپور میں 'پلاسٹک کے پھول' عنوان سے ۱۹۷۷ء میں چھپی تھی۔

یا گولیاں کھیلتا اور سورج ڈھلتے ہی اپنی ٹوکری سجا کر انڈیا گیٹ پہنچ جاتا۔

ایک روز جب نندو ٹوکری اٹھائے انڈیا گیٹ کی طرف جارہا تھا تو پڑوس میں رہنے والی بِلّی نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ عمر میں نندو سے ایک ہی سال چھوٹی تھی۔

''کہاں جارہے ہو نندو؟'' بِلّی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''انڈیا گیٹ۔ یہ پھول ہیں ناں پھول۔ اس ٹوکری میں۔ انہیں بیچنے''۔ نندو کے لہجے میں خوشی اور طفلانہ شوخی کی ملی جلی کیفیت نمایاں تھی۔

''کتنے سُندر ہیں یہ پھول!'' بِلّی نے بڑے ہی اشتیاق سے کہا۔

''چاہئیں؟'' نندو نے ٹوکری سر سے نیچے اُتاری اور اپنی پسند کا ایک خوبصورت پھول بِلّی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بِلّی پھول کو دیر تک سونگھتی رہی اور خراماں خراماں نندو کے ساتھ چلتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں انڈیا گیٹ پہنچ گئے۔ بِلّی نے پھول کلِپ کے سہارے اپنے بالوں میں سجایا اور پھر نندو کی بغل میں بیٹھی رہی۔ بِلّی کی رنگت سرمئی تھی۔ پتلی پتلی ٹانگیں، پتلے پتلے بازو، موٹی بِلیوں جیسی چمکدار نیلگوں آنکھیں اور پیارا پیارا سا گول مٹول چہرہ۔ ہنستی تھی تو موتیوں جیسے سفید دانت سرمئی پس منظر میں بہت ہی خوبصورت دکھتے۔ کالے گھنیرے بالوں کو گھتنے کا اُس کا انداز بھی نرالا تھا۔ یہ اس کی آنکھیں ہی تھیں جن کی وجہ سے لوگ اُس کو بِلّی کے نام سے پکارتے تھے۔

نندو کا انتظار، اُس کا دیا ہوا پھول بالوں میں سجانا اور پھر انڈیا گیٹ کے نزدیک اُس کے ہمراہ پھولوں کی بکری کرنا بِلّی کا معمول بن گیا۔ رفتہ رفتہ بِلّی کو یہ احساس ہوا کہ بیکار بیٹھنے کے بجائے وہ نندو کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ وہ ہر روز اپنے گھر سے سوئی دھاگا لے کر آتی اور موتیا، بیلا اور چمیلی کے گجرے بناتی یا پھر گیندوں کو پرو کر اُن کی مالائیں تیار کرتی۔ نئے نویلے جوڑے، جو شام کو آئس کریم کھانے کے لیے انڈیا گیٹ چلے آتے، اُن کے خاص خریدار بن گئے۔ گجرے خریدتے وقت وہ اپنے بدن پر ملی ہوئی سینٹ کی بناوٹی خوشبوان دو معصوم بچوں کے اردگرد چھوڑ جاتے جس کی وجہ سے نہ صرف پھولوں کی اصلی اور قدرتی

خوشبو کچھ دیر کے لیے مسخ ہو جاتی بلکہ نند واور ربّی دونوں کے پاؤں اُکھڑ جاتے اور وہ اپنی غربت کو من ہی من میں کوستے رہتے۔

نند واور ربّی کو گل فروشی میں ایک عجیب سا آنند آجاتا۔ انہیں نہ تو نفع کی فکر تھی اور نہ ہی نقصان کا غم۔ پھول بکیں یا نہ بکیں اس کی پریشانی نند وکو تھی نہ ربّی کو۔ کون پورا پیسہ دیتا ہے اور کون بھاؤ تاؤ کرتا ہے، انہیں اس کی کوئی چنتا نہ تھی۔ انہیں صرف اس بات کی فکر لگی رہتی تھی کہ کب سورج ڈوبے اور وہ انڈیا گیٹ پہنچ جائیں۔ نندواور ربّی کے اس میل جول کو کیا نام دوں میری سمجھ میں نہیں آتا۔ پیار تو کہہ نہیں سکتا۔ آخر ان کی عمر ہی کتنی تھی کہ محبت کے قول وقرار کرتے۔ تاہم دونوں کو ایک دوسرے کا شدت سے انتظار رہتا اور اگر کسی دن ربّی نہیں آپاتی تو نند وکو گل فروشی میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔ اُس روز وہ آدھی ٹوکری بیچ کر ہی واپس گھر چلا آتا لیکن جس دن دونوں ساتھ ساتھ ہوتے تو گھنٹوں کا وقت منٹوں میں اور منٹوں کا وقت سیکنڈوں میں گزر جاتا۔ دونوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گول مٹول کنکر چن کر گٹیوں کا کھیل کھیلتے رہتے۔

ایک دن فیروز نند و کے سامنے کھڑا ہو کر اُسے پوچھنے لگا۔

''بیٹے، تم یہ پھول کہاں سے لاتے ہو؟''

''اپنے باگ سے۔ شاب! اور کہاں شے لاؤں!'' نندو نے پوچھنے والے کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''کتنا بڑا باغ ہے؟''

''شاب''، بوہت بڑا ہے۔ بوہت بڑا۔ وہاں تو بوہت شارے پھول کھلتے ہیں۔ اتنے شارے پیڑ پودے ہیں۔ وہ کیا ہے کہ ایک شائیڈ تو گلاب ہی گلاب ہیں۔ شاب شچ پوچھو تو وہ باگ اپنا نہیں ہے۔ میرے بابا تو وہاں پر ہیڈ مالی کا کام کرتے ہیں۔''

''اوہ میں سمجھا۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''نندو''۔

''اچھا یہ بتاؤ کیا تمہارے باغ میں کالا گلاب اُگتا ہے؟''

''کالا گلاب۔؟ کیوں مجاک کرتے ہو شاب۔ گلاب کوئی کالا بھی ہوتا ہے .....؟''

نند و فیروز کو حیرت سے تک رہا تھا۔

''نندو میں مذاق نہیں کر رہا ہوں''۔

''شاب میں نے تو آج تک کبھی سُنا ہے نہ دیکھا''۔ اُس کم سن لڑکے کا جواب پا کر آج پہلی بار فیروز کو اپنی کھوج کی حماقت کا اندازہ ہوا۔ وہ بلّی کو غور سے دیکھنے لگا جو ساری گفتگو کے دوران ہاتھ میں کنکر لیے فیروز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا معصوم سیاہی مائل چہرہ قمقموں کی روشنی میں بہت ہی دلکش لگ رہا تھا۔ وہ بالکل کالے گلاب کی کلی سی لگ رہی تھی۔

''یہی تو ہے وہ کالا گلاب جس کی تمہیں برسوں سے تلاش تھی۔ دیکھو فیروز، اس کو غور سے دیکھو۔ ہے نا یہ بھگوان کی انوکھی رَچنا۔ ان چھوئی معصوم کالے گلاب کی کلی!''

فیروز کے دل میں ہل چل سی مچ گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیسے عجیب لوگ ہیں ہم۔ پھولوں، پودوں اور جانوروں سے ہمیں اتنا انس ہے کہ اُن کی دیکھ بھال میں رات کی نیند اور دن کا چین گنواتے ہیں مگر ان ننھی منی کلیوں کو نظر انداز کرتے ہیں کیوں کہ یہ ہماری ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔

بلّی کو فیروز کا اتنی دیر اس طرح گھورنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اور پھر وہ ان کے کھیل میں مخل بھی تو ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ کنکر سے فیروز کی آنکھ پھوڑ دے۔

فیروز نے ضرورت نہ ہونے کے باوجود پانچ گجرے خریدے اور جا کر اپنی کار میں لٹکا دیئے۔

نند و اور بلّی کی نظریں بہت دیر تک اُس کا تعاقب کرتی رہیں۔ پہلے فیروز کا، پھر اُس کی کار کا اور اس کے بعد کار سے نکلتے ہوئے دھوئیں کا۔

''نند و! ایک بات بتاؤں''۔ جونہی کار ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو بلّی نند و سے

مخاطب ہوئی۔

''ہاں، بتاؤ تو......''

''یہ شاب ہے ناں۔ یہ مجھے کچھ اچھے آدمی نہیں لگتے ہیں''۔

''تمہیں کیسے مالوم؟''

''میں نے اپنی ماں سے سُنا ہے۔ وہ ایک دن پتاجی سے کہہ رہی تھی کہ رام سنگھ اچھا آدمی نہیں ہے کیونکہ وہ اُس کو گھورتا ہے۔ نندو یہ بابو جی بھی مجھے گھور رہا تھا''۔

''ہٹ پگلی، یہ تو ہمارے پتا شمان ہیں۔''

اس روز کے بعد جب بھی فیروز انڈیا گیٹ آجاتا تو نندو سے گجرے اور پھولوں کی مالائیں ضرور خریدتا۔ پہلے پہل ان کا استعمال سمجھ میں نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ اس کا بھی حل نکل آیا۔ گجرے کار میں لٹکا دیئے جاتے اور پھولوں کی مالائیں گھر میں دیوار پر ٹنگی بیوی اور بچی کے فوٹوؤں کو پہنائی جاتیں۔

شاہدرہ میں فیروز کی پلاسٹک کی فیکٹری تھی۔ اُس نے حال ہی میں اپنی فیکٹری میں جاپانی تکنالوجی پر مبنی جدید پلاسٹک کے پھول بنانے کی مشینیں نصب کروائی تھیں۔ ان مشینوں سے تیار شدہ مصنوعی پھولوں اور اصلی پھولوں میں رتی بھر کا فرق نہ تھا۔ فرق اگر تھا تو صرف اس بات کا کہ بناوٹی پھولوں سے خوشبو نہیں آرہی تھی۔ فیروز کا یہ نیا کاروبار اچھا چل نکلا۔ سارا مال ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ کچھ عرصہ بعد جب وہ اپنی کار میں انڈیا گیٹ کی جانب جا رہا تھا تو اُس کے من میں خیال آیا کہ کیوں نہ نندو اور بلی کی زندگیاں سنواری جائیں۔ اُن کو کسی اچھی جگہ کوئی چھوٹا سا کھوکھا دلوایا جائے جہاں وہ اس کی فیکٹری میں تیار شدہ پلاسٹک کے پھول بیچ سکیں۔ اس طرح ان کی آمدنی کافی بڑھ سکتی ہے۔ لیکن دلی میں کھوکھا ملنا تو درکنار کہیں فٹ پاتھ پر بیٹھنے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ فیروز نے اپنے ایک قریبی دوست سے اس بارے میں بات کی اور نندو کے لیے اُس کے ہوٹل کے گیٹ کے ساتھ بیٹھنے کا انتظام کروایا۔ پھر نندو کو فیکٹری لے جا کر ڈھیر سارے پلاسٹک کے پھول دو بالٹیوں میں

ڈال کر دیئے۔ گھر لوٹتے سمے نندو کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

نندو اس خیال ہی سے جھوم اُٹھا کہ سرمائے کے بغیر اُس کی دوکان لگنے والی ہے۔ اُس نے سب سے پہلے یہ خوشخبری بلّی کو دینا چاہی۔ اُس کو تو یہ گماں بھی نہ گزرا ہوگا کہ صاحب کی یہ عنایتیں تو اُسی کے بھولے بھالے چہرے کی بدولت تھیں۔ بلّی بھی یہ خبر سن کر خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ خبر سنتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔ ''سچ، سچ کہتے ہو نندو! ہمارے شاب کتنے اچھے ہیں''۔

''تم تو کہتی تھی کہ شاب بُرے آدمی ہیں'' نندو نے چڑاتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بابا، میں تو یوں ہی مجاک کر رہی تھی''۔

''کل تم میرے ساتھ دُکان پر آنا۔ دیکھنا کیسا مجا آئے گا''۔ نندو نے بلّی سے تاکید کی۔

رات بھر نندو اور بلّی دونوں پھولوں کی دوکان کے سپنے دیکھتے رہے۔ اور پھر گجر دم تک کروٹیں بدلتے رہے۔ بلّی دعا کرتی رہی کہ پوری رات سمٹ کر لمحے بھر کی ہو جائے اور وہ جا کر نندو کی پھولوں سے سجی ہوئی دوکان دیکھ لے۔

دوسری صبح بلّی نندو کا انتظار کرتی رہی۔ نندو ٹھیک دس بجے بلّی کے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کی دو بڑی بالٹیاں تھیں جن میں طرح طرح کے رنگ برنگے پھول سجے ہوئے تھے۔ نندو کی آواز سنتے ہی بلّی دوڑتی ہوئی گھر سے باہر نکل آئی۔ اس کو پورا یقین تھا کہ ہر روز کی طرح نندو اس کے لیے ہاتھ میں مہکتا گلاب لے کر باہر کھڑا ہوگا جس کو وہ اپنے بالوں میں سجا لے گی۔ وہ نندو کے قریب پہنچ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ نندو کا ہاتھ عادتاً پھولوں کی بالٹی، جو اس نے سڑک پر رکھ دی تھی، کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے اُس کو یہ احساس ہوا کہ اُس کے پاس اب اصلی پھول نہیں بلکہ پلاسٹک کے پھول ہیں جن میں خوشبو ہے نہ بالوں میں سجانے کی قابلیت۔ ان دونوں بالٹیوں میں ایسا کوئی بھی پھول نہیں تھا جو بلّی اپنے بالوں میں سجا سکتی تھی۔ نندو کا ہاتھ خود بخود رک گیا۔ وہ پشیمان

و پریشان بلّی کو دیکھتا رہ گیا۔

بلّی کو ایسا لگا جیسے اُس کو ہزار وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی دیکھتے مرجھا گیا۔

''نندو! تم جا رہے ہو کیا''۔

''کیوں، تم نہیں آؤ گی کیا؟ تم نے تو کہا تھا کہ تم بھی میرے شاتھ آؤ گی''۔

''ٹھیک ہے، میں ابھی آتی ہوں۔ شوئی دھاگہ تو لے آؤں۔'' وہ گھر کی طرف مڑنے ہی والی تھی کہ نندو نے اس کو روک لیا۔

''اری پگلی، وہاں شوئی دھاگے کا کیا کام۔ ان پھولوں کی مالائیں نہیں بنتی ہیں۔''

''اور گڑیاں؟..... گڑیاں تو کھیل شکتے ہیں''۔

''اری، وہ تو بوہت بڑا ہوٹل ہے۔ بڑے بڑے میم شاب لوگ وہاں آتے ہیں۔ وہاں گڑیاں تھوڑے ہی کھیل پائیں گے''۔

''پھر گڑیاں کہاں کھیلیں گے۔ شام کو انڈیا گیٹ چلیں گے''۔

''نا بابا نا۔ ایک تو دن بھر دُکان لگاؤ۔ پھر شام کو انڈیا گیٹ۔ یہ کیشے ہو شکتا ہے''۔ نندو نے صاف گوئی سے کام لیا۔

بلّی مایوس ہو گئی۔ اس کا ہاتھ دفعتاً بالوں میں لگی کلپ کو چھو رہا تھا۔ اُس کو یوں محسوس ہوا کہ بڑے صاحب نے اس کے بالوں سے اُس کا پھول ہی چرا لیا۔ اُس کی آنکھوں میں دھند لکا سا چھا گیا۔ اور پھر دو موتی جیسے گرم گرم آنسو بہہ نکلے۔ وہ مڑ کر واپس اپنے کوارٹر کی طرف دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ نندو وہیں گیٹ پر کھڑا بلّی کو پکارتا رہا۔ کئی روز پکارتا رہا۔ مگر بلّی پھر کبھی اپنے گھر سے نہ نکلی۔

ادھر فیروز کئی دنوں تک نندو کی تلاش کرتا رہا مگر وہ اُسے کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ آخر کار فیروز نے انڈیا گیٹ کا رخ کیا۔ اُس کا نندو وہیں اپنی جگہ پر گل فروشی کر رہا تھا۔

''نندو۔ تم!''

''ہاں شاب۔ میں''

''یہ کیا۔تم نے تو وہ دوکان ایک دن بھی نہیں کھولی۔ آخر بات کیا ہے؟ کہیں کسی نے دکان لگانے سے منع تو نہیں کیا؟ میں نے کئی بار تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر تم تو وہاں ملے ہی نہیں۔ پھر فیکٹری منیجر سے پتہ چلا کہ تم نے پھولوں کی دونوں بالٹیاں واپس کردی ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ خیریت تو ہے نا؟''فیروز کی پریشانی اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھی۔

''شاب وہ کام ہم شے نہیں ہوگا۔ہمیں تو بش یہی کام پشند ہے۔ اش لیے پھر یہیں پر آ گئے۔''

''اور وہ،......وہ......کیا نام تھا اس کا؟ ہاں بلّی۔ وہ کہاں ہے؟''

''شاب۔بس وہی تو رونا ہے۔ جب سے میں نے آپ کی دی ہوئی بالٹیاں ہاتھوں میں اٹھالیں تب شے وہ روٹھ کر چلی گئی۔ وہ تو اپنی شورت بھی نہیں دکھاتی۔ بابوجی، مجھے تو اب کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اُش کے بغیر تو شب کچھ کھالی کھالی شا لگ رہا ہے''۔ چندروز میں ہی نندو کے لہجے میں میچورٹی آ چکی تھی۔

فیروز سب کچھ سمجھ گیا۔اس کے چہرے پر احساسِ گناہ کے تاثرات نمودار ہوئے۔وہ اپنے آپ کو ان دو ننھی منی جانوں کے بیچ دیوار کھڑی کرنے کا ذمہ دار ٹھہرانے لگا۔

☆☆☆

اَدھ کھلی

ہمالیہ کی گود میں بسا ٹینگا ویلی کنٹونمنٹ قدرت اور انسانی کاوش کا شاہکار ہے۔ اس خوبصورت جگہ کو دیکھنے کا شرف مجھے فوج کی ملازمت کے سبب حاصل ہوا۔ تیج پور، آسام سے سڑک ناگن کی طرح بل کھاتی، پہاڑیوں کی گود میں جھولتی ہوئی اس مقام تک پہنچ جاتی ہے اور پھر آگے دِرانگ سے ہوتی ہوئی تو انگ تک چلی جاتی ہے جہاں بودھوں کی قدیم خانقاہ ہے جو دنیا بھر میں مشہور لاسا گومپا سے کچھ کم نہیں۔ چھاونی چونکہ ٹینگا چو دریا کے کنارے پہاڑی سلسلے پر دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اس لیے افسروں کے رہائشی مکانات فوجی ہیڈ کوارٹر سے تقریباً دس کلو میٹر کے فاصلے پر ہیں۔

۱۹۶۲ء میں چینی فوجیں اسی راستے سے تیج پور تک پہنچ چکی تھیں۔ توانگ، سے لاء، بِلما ڈانگ، دِرانگ، بوم ڈِی لاء، اور ٹینگا۔ یہ سب علاقے دشمن کے قبضے میں آ چکے تھے۔ ہزاروں جوانوں نے اپنی جانیں نثار کر کے ان علاقوں کی حفاظت کرنے کی کوشش کی تھی۔ نِلما ڈانگ کے پاس توانگ سے پیچھے ہٹتی ہوئی فوجوں کا جب چینیوں نے شب خون مارا تھا تو کئی ہزار جانیں تلف ہو گئیں۔ جنگ ختم ہوتے ہی چینی حملہ آوروں نے اس علاقے کو خالی کر دیا اور بارڈر روڈز نے اس علاقے میں سڑکیں اور چھاونیاں بنا کر رسل و رسائل کو پھر سے بحال کرنے کا بیڑہ اُٹھالیا۔ کسی منچلے افسر نے بارڈر روڈز کے اس دستے کا نام ''فکرناٹ'' ٹاسک فورس رکھا جو تب سے بنا کسی فکر و غم کے اپنے کام میں جٹا ہوا ہے۔

رہائش سے دفتر کی دوری میں ہر روز جونگا سے طے کرتا۔ سڑک کی دونوں طرف ہریالی چھائی رہتی جس سے طبیعت کھل اُٹھتی۔ شہروں کے سیمنٹ کنکریٹ جنگلوں میں ایسے

مناظر ملنا تو بعید القیاس ہیں۔

اپریل کا مہینہ تھا۔ موسم میں عجیب سی تازگی تھی۔ ہر طرف شگوفے اپنے شباب پر تھے۔ ہوا میں جیسے کسی نے شراب گھول دی تھی۔ جس سڑک پر میرا روز کا آنا جانا رہتا تھا اُس کی مرمت سردیوں کے اختتام پر پھر سے شروع ہو چکی تھی۔ دو چار جگہ عارضی لیبر کمپ بس چکے تھے۔ جگہ جگہ عورتیں سڑک پر بیٹھیں اپنے ہاتھوں میں ہتھوڑے لیے چھوٹے بڑے پتھروں کو کوٹنے میں منہمک تھیں۔ پاس ہی کئی آدمی ایک پہاڑی سے بڑے بڑے پتھر توڑ کر ان مزدور عورتوں کے سامنے لا کر پٹک دیتے۔ عورتیں زیادہ تر بیس سے پچاس کی رینج میں تھیں۔ ان کے بچے نزدیک ہی جھگی جھونپڑیوں کے پاس کنچے کھیلتے، پتنگیں اُڑاتے یا پھر گلی ڈنڈا کھیلتے۔

بیس اپریل کی صبح کو ایک ایسی گھٹنا گھٹی جو آج تک مجھے یاد ہے۔ دیر رات تک بارش ہونے کی وجہ سے ساری وادی اُجلی اُجلی لگ رہی تھی۔ ہلکی پیلی سورج کی کرنیں پہاڑوں کی اوٹ سے نکل کر پھول پتیوں کو چومنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اتنے میں میری نظر پہلی بار جُلکا پر پڑی جو اپنے خیمے کے پاس ہی ایک چٹان کے سہارے کھڑی ہواؤں کے دوش پر لہرا رہی تھی۔ عمر یوں ہی کوئی سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ اُس حُسنِ ناتمام کا لال دوپٹہ اور کالی گھنیری زلفیں ہواؤں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ نیم باز آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے مونا لزا کی وہ یادگار تصویر، جو میں نے لووَر (پیرس) کے میوزیم میں دیکھی تھی، یاد آرہی تھی۔ نفاست، پاکیزگی اور معصومیت کا حسین پیکر۔ اور پھر رخسار پر وہ دلفریب ڈمپل تو مونا لزا کو بھی مات کر جاتا۔ اس کھلنے والی ناشگفتہ سی کلی کے سینے سے ابھی پہلی کرن بھی نہیں پھوٹی تھی۔

پاس سے گزرتے ہوئے جب ڈرائیور نے ہارن بجائی تو وہ ٹھٹھک گئی۔ اُس کے خیالوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ اپنے آپ کو سمیٹتی ہوئی وہ لاپرواہی سے ہٹ تو گئی مگر ڈرائیور کو گھورتی رہی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ''چل ہٹ شرارتی کہیں کے، کیوں جان بوجھ کر چھیڑ رہا ہے مجھے''۔

میں نے چلتی گاڑی سے ہی اُس کا جائزہ لیا۔ خاموشیوں میں اُس کے تکلم کا انداز اور زبانِ نظر پر وہ حیا کی کہانی میرے من کو بھا گئی۔ جُلکا جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ اس کی فطرت سے غنچگی اور دوشیزگی صاف طور پر عیاں تھی۔ اُس کا جوبن امنڈ رہا تھا۔ ہر انگ سے مستی کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اس کی ہر انگڑائی میں قیامت چھپی ہوئی تھی۔ وہ ساغر میں صہبا اور مینا میں شراب کی مانند تھی جو ابھی مچلی، چھٹکی یا ابلی نہیں تھی۔

قسمت کی ستم ظریفی یہ کہ جس معصوم کلی کو سنگ تراش کا ماڈل ہونا چاہیے تھا وہ اب خود ہی سنگ ریزی کرتے کرتے پسینے میں شرابور تھی۔ ان نرم و نازک ہاتھوں میں اب بھاری بھر کم ہتھوڑا دکھائی دینے لگا تھا۔ لباس پر مٹی اور دھول کی پرتیں جم چکی تھیں۔ معصوم کلائیاں آہنی ہتھوڑے کے وزن کی تاب نہ لا کر نڈھال ہو چکی تھیں۔ نرم و نازک پاؤں پر، جو نوکیلے پتھروں سے چھل چکے تھے، حنا کے بدلے خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ ہلکا نیلا کرتا جگہ جگہ کٹ پھٹ چکا تھا جس کے اندر سفید مرمریں بدن اس کی معصومیت کی چغلی کر رہا تھا۔

ٹاسک فورس کا سپروائزر نزدیک کسی چٹان پر بیٹھ کر یا پھر کسی درخت کی آڑ میں کھڑا سب مزدوروں کے کام کاج پر نگرانی رکھتا تھا۔ بلالحاظ عمر و جنس کے وہ بڑی سختی اور سنگدلی سے ان مزدوروں سے کام لیتا۔ آخر کرتا بھی کیا۔ وہ بھی تو جواب دہ تھا۔ اُس کے اوپر بھی تو کئی افسر تھے۔ اگر کام وقت پر مکمل نہیں ہوتا تو اس کی ترقی رکنے کا احتمال تھا۔ مگر جُلکا جب سے آئی تھی سپروائزر کی کایا ہی پلٹ گئی۔ صدف میں چھپے اس موتی کی چمک ابھی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ کہتے ہیں مسکراتی ہوئی لڑکی اور کھیلتی ہوئی بھیڑ کو ہر کوئی ہنکا کر لے جاتا ہے۔ جُلکا کے سحر کے سامنے سپروائزر کی ایک نہ چلی۔ اس دن کے بعد جب بھی میں وہاں سے گزرا سپروائزر کو کبھی تنہا نہ پایا۔ وہ جہاں بھی بیٹھا ہوتا، چاہے چٹان پر یا کسی پیڑ کے سائے میں، وہاں جُلکا ضرور ہوتی۔ دونوں نہ جانے کیا کھسر پھسر کرتے رہتے۔ جُلکا بار ہا بے خود ہو کر کھلکھلا اٹھتی جیسے کسی نے گدگدی کی ہو۔ اس برجستہ کھلکھلاہٹ میں فکر و تردد کی رتی

بھر بھی ملاوٹ نہ تھی۔ وہ سپروائزر کی توجہ کا مرکز بن چکی تھی اور اس کی مہربانیوں کی برسات میں شرابور ہورہی تھی۔ اب اُس کے ہاتھوں میں خال خال ہی ہتھوڑا دیکھنے کو ملتا۔ وہ ہر صبح ہرنی کی طرح آتی۔ زیادہ تر وقت سپروائزر کی خاطرداری اور اس کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں گزار دیتی اور شام ہوتے ہی مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی چلی جاتی۔ دوسرے مزدوروں کو بھی اس بے نام رشتے سے راحت مل رہی تھی کیوں کہ سپروائزر کا دھیان بٹا رہتا اور وہ اب پہلے جیسی کڑی نگرانی نہیں کر پاتا تھا۔

کئی بار جب مجھے جُلکا یا سپروائزر نظر نہیں آتے تو میری آنکھیں بے چینی سے اُن کو چاروں اطراف میں ڈھونڈنے لگتیں۔ نہ ملنے پر دل بہت مایوس ہو جاتا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ صبح سویرے میں آفس نہیں بلکہ جُلکا کے دیدار کے لیے نکل پڑتا ہوں۔ اس کی شکل وصورت میرے دل ودماغ میں ایسے رچ بس گئی تھی کہ آفس اور گھر دونوں جگہ میں اُس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ نہ جانے کس پیڑ کے نیچے وہ سپروائزر کے زانو پر اپنا سر رکھ کر اُس کی آنکھوں میں اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہوگی یا پھر سپروائزر اُس کے گرم گرم سانسوں کی حرارت اور بھرے بھرے سینے کی نرماہٹ سے سرمست ہو کر اس کے شیریں لبوں کا رس چوس رہا ہوگا۔ جُلکا سپروائزر تک پہنچنے کے لیے ہر زینے کو پار کرنا چاہتی تھی۔ آدمی کی پرواز بھی اس کی موجودہ حالت سے جڑی ہوتی ہے۔ جلکا اپنا سارا وجود کھو دینا چاہتی تھی جبکہ میں ان دونوں کو کسی کلہاڑی سے الگ کرنے کا متمنی تھا۔ مجھے نہیں معلوم اس میں میری جلن کارگر تھی یا رحمدلی۔ میرے دل میں خیال آتا کہ ایک بڑا سا چھاتا بن کر جُلکا کو اپنی شرن میں لے لوں اور اس کو دنیا کی نظروں سے بچا لوں۔ اضطراب کا یہ عالم تھا کہ دو مہینے کی سالانہ چھٹی لے کر گھر جانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ خدشہ یہ تھا کہ اُسی درمیان جُلکا دنیا کی بھیڑ میں کہیں کھو نہ جائے۔ تاہم چھٹی پر جانا ہم فوجیوں کے لیے لازمی تھا۔

وقت کے بھی جیسے پر لگ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھ مہینے بیت گئے۔ سالانہ چھٹی کاٹ کر جب میں لوٹا تو آنکھیں جُلکا کا دیدار کرنے کے لیے ترس رہی تھیں۔ اگلا دن چونکہ

اتوار تھا اس لیے دفتر جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جُلکا کو میں سوموار کی صبح کو ہی دیکھ پاتا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ گیراج سے اپنی نجی کار لے کر میں جُلکا کے کیمپ کی طرف چل پڑا۔

جُلکا مجھے اسی موڑ پر ملی جہاں پہلے کبھی میں نے اس الہڑ لڑکی کو ہواؤں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ آج بھی وہیں اسی جگہ اُسی چٹان کے سہارے بیٹھی ہوئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ذہنی دہلیز پار کر کے مایوسی کا ایک پیکر بن چکی تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بے ترتیب بال تیز ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ آج بالوں کی بکھری لٹیں برگد کی جٹاؤں ایسی لگ رہی تھیں۔ اُس کی مسکراہٹ اس کے زرد ہونٹوں پر منجمد ہو چکی تھی۔ وہ گم صم بیٹھی اپنے پیٹ کے اُبھار کو غور سے دیکھ رہی تھی اور اس کا پھٹا ہوا دوپٹہ اس اُبھار کو ڈھکنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

تھوڑی دوری پر میں نے اپنی کار روک لی اور جُلکا کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں پاس کے جھونپڑے سے ایک لاغر آدمی، شراب کے نشے میں دُھت، تمباکو اور تامُل (کچی سپاری) چباتے ہوئے نمودار ہوا۔ وہ چیل کی مانند جُلکا پر جھپٹ پڑا اور اس کو بالوں سے پکڑ کر جھونپڑے کی جانب گھسیٹنے لگا۔ غصے کی حالت میں وہ چیخ اٹھا۔

''کیا کر رہی ہے تو یہاں؟ کتنی بار منع کیا ہے تجھ کو کہ یہاں مت بیٹھا کر۔ کس کا انتظار کر رہی ہے؟'' لال بدبودار پیک کو تھوک کر وہ پھر غرایا۔ ''سالے اس سپروائزر کا جس کا حرامی پلا کوکھ میں پل رہا ہے۔ وہ اب نہیں آئے گا۔ سالا، نہ جانے اس کے کتنے حرامی پلے ان بستیوں میں پل رہے ہوں گے۔ چل اندر چل۔ گھر کا کام کر۔ ناشتہ بھی نہیں بنایا ابھی تک۔ میں کہے دیتا ہوں۔ میں تیرا مرد ہوں۔ مرد.......! اگر تم پھر اس حرام جادے کو ڈھونڈنے نکلی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

اچانک میرے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں رُکوں، آگے بڑھوں یا پھر لوٹ کر واپس چلا جاؤں۔ ☆☆

بیسوا

'پاکیزہ' فلم سے ہم اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ سینما ہال سے نکلتے ہی ہم نے اگلے اتوار کو مجرا دیکھنے کا پروگرام بنالیا۔ اپنی جیبیں دیکھ کر مایوسی ضرور ہوئی لیکن ہمت نہ ہاری۔ مجید چونکہ بنک میں کلرک تھا، اس نے پانچ روپے کے نئے سبز نوٹوں کے دو بنڈلوں کا انتظام کیا۔ پھر کیا تھا۔ گڈیاں جیب میں ڈالیں، بوسکی ریشم کا سفید کرتا زیب تن کیا، منہ کو پان کی لالی سے رنگ دیا اور ڈی ٹی سی کی بس سے نئی دلی اسٹیشن پہنچے۔ پھر اسٹیشن کے قریب بنی سیڑھیاں چڑھ کر اجمیری گیٹ پہنچے جہاں سے جی بی روڈ کا آغاز ہوتا ہے۔ گو اب اس روڈ کا نام بدل کر سوامی شردھانند سے منسوب ''شردھانند مارگ'' رکھا جا چکا ہے پھر بھی اس کو بدنام جی بی روڈ کے نام ہی سے جانا جاتا ہے۔

سہمے سہمے ہمارے قدم رات کے اندھیرے میں گنگھروؤں کی اس آواز کا تعاقب کر رہے تھے جو کہیں دور کسی مکان کی دوسری منزل سے آ رہی تھی۔ سڑک پر پولیس ہاتھ میں لاٹھیاں لیے ہوئے گشت لگا رہی تھی۔ جب بھی کسی پولیس کانسٹبل کا سامنا ہو جاتا تو سارے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو جاتی اور ہم نظریں چرا کر آگے کھسک جاتے۔ دل خوف و ہراس سے بیٹھا جا رہا تھا۔ دونوں اسی سوچ میں غرق تھے کہ کہیں پولیس حراست میں نہ لے، ساری عزت مٹی میں مل جائے گی۔ تجسس کا یہ عالم تھا کہ آنکھیں ہر اس مکان کی طرف اٹھتیں جس کی کھڑکیوں پر لگی چق کے بیچ سے تیز روشنیاں چمک رہی تھیں یا پھر جہاں سے کسی ساز کی آواز آ رہی تھی۔ کچھ دور جا کر نظریں بیلا چمیلی کے گجروں اور موتیا موگرا کے پھولوں پر پڑیں۔ نصف درجن گجرے خریدے۔ بغل والی دوکان سے مزید دو جوڑے پان کے

---

* یہ کہانی پہلی بار گلبن احمد آباد میں ۱۹۹۸ء میں بعنوان 'کیچڑ میں کھلا کنول' چھپی تھی۔

خریدے اور منہ میں داب لیے۔ تب کیا تھا بس محفل میں بیٹھنے کی دیر تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ''پاکیزہ'' کا خوبصورت سیٹ گھومنے لگا۔ من ہی من میں سوچنے لگا کہ ہال میں داخل ہوتے ہی ادب سے جھک کر سلام کروں گا۔ پھر ایک جانب گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر رقاصہ کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کروں گا۔ نزدیک آتے ہی پانچ پانچ روپے کے کئی نوٹ اُس کی نذر کروں گا۔

جس مکان سے ناچ گانے کی آواز آرہی تھی ہم اس کے قریب پہنچ گئے۔ ایک تنگ وتاریک زینے کو طے کر کے ہم اس کمرے تک آپہنچے جہاں رقص کی محفل سجی تھی۔ ایک کے بعد ایک دونوں دوستوں نے اپنی اپنی نشست سنبھالی۔ ٹھیک سامنے ایک ادھیڑ عمر کی عورت ناچ رہی تھی۔ کئی سازندے ساز بجا رہے تھے۔ کمرہ عام کمروں کی طرح ہی سجا ہوا تھا۔ میلے کچیلے گاؤ تکئے دیواروں کے ساتھ سٹے ہوئے تھے۔ رقاصہ کے جسم میں تناسب نام کی کوئی بھی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بونا قد، لمبا مردانہ چہرہ، کشادہ نتھنوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی چپٹی ناک، زرد دانت جن پر پان کھانے کے سبب مستقل بھوری کائی جم چکی تھی، موٹے موٹے ہونٹ اور چوڑے کولہے۔ آواز ایسی کہ ہیجڑوں کا گانا کہیں زیادہ سریلا لگتا۔ جی میں آیا کہ دو تین نوٹ منہ پر مار کر بزم سے اٹھ جاؤں مگر آدابِ محفل کا تقاضہ ہی کچھ اور تھا۔ کئی بار میں نے نظریں ملانے کی کوشش بھی کی لیکن وہ خود بخود رقاصہ کے چیچک زدہ چہرے سے ٹکرا کر فرش پر منتشر ہو جاتیں۔ جب کبھی اس نے نزدیک آنے کی کوشش کی تو میں نے دور ہی سے دو چار نوٹ پھینک کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

چند ہی لمحوں میں 'پاکیزہ' فلم کا نشہ کافور ہو چکا تھا۔ یہ سیٹ حقیقی تھا۔ مصنوعی نہیں۔ یہاں نہ تو وہ چمکتا دمکتا فرش تھا، نہ وہ ایرانی قالین تھے، اور نہ ہی وہ چھت سے لٹکتا ہوا بلوریں فانوس۔ نہ وہ بکا ؤ حسن تھا اور نہ ہی نوابی شان والے خریدار۔ یہ غریب لاچار عوام کا معمولی سیٹ تھا جہاں وہ گھریلو زندگی کے تفرقات سے نجات حاصل کرنے کے کوشاں تھے۔ آخر کار پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ عورتوں نے روکنے کی کوشش کی

مگر میں نہ رکا۔ میرا دوست، جو خود بھی اسی موقع کی تلاش میں تھا میرے پیچھے ہو لیا۔

ہم پھر اسی سڑک پر انہی قمقموں کی روشنیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے جنہیں ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی نے ہماری لاچاری کو بھانپ لیا۔ سامنے آکر ہمدردی جتائی اور میرے دوست سے پوچھا۔ ''بھائی صاحب، مال چاہیے کیا؟''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ یک زبان ہو کر ہامی بھر لی۔ ''سو روپے نکالو'' اس نے ہماری مجبوری کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ مجید نے جلدی سے پانچ پانچ کے بیس نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمائے۔

''میرے پیچھے چلے آؤ'' دلال نے مودبانہ آواز میں گزارش کی۔

ایک تنگ و تاریک سیڑھی چڑھ کر ہم اوپر پہنچ گئے جہاں ناچ گانے کے بجائے بالکل کاروباری سا ماحول تھا۔ وہ ایک کمرے میں گھسا۔ یہ سوچ کر کہ وہ واپس آئے گا اور ہمیں بھی اندر لے جائے گا ہم باہر ہی اس کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ رفو چکر ہو گیا اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ سامنے کھڑی ایک دبلی پتلی عورت نے، جس کی عمر تقریباً پچاس سال تھی، ہم سے ہماری پریشانی کا سبب پوچھا اور ہم نے من وعن ساری روداد سنادی۔ ترس کھا کر اس نے ہمیں اندر کمرے میں بلایا اور گویا ہوئی۔

''جیب میں کچھ بچا ہے یا کچھ بھی نہیں؟''

میں نے اپنی جیبیں ٹٹول کر سارے روپے باہر نکالے اور بڑھیا کو ایک سو روپے پیش کئے۔ وہ مجھے اندر کمرے میں لے گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اندر کوئی جواں سال حسینہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ بڑھیا نے میری جانب ایک پیار بھری نظر ڈالی اور اپنے آپ کو میرے سپرد کرنے کی پیش کش کی۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ بڑھیا کا وہ روپ مجھے ہرگز قبول نہ تھا۔ برق رفتاری سے میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہاتھ میں اپنے جوتے اٹھائے اور زینے کو پھلانگتا ہوا پھر اسی سڑک پر آپہنچا۔ میری تقلید میں مجید بھی میرے پیچھے دوڑتا چلا آیا۔

ہارے ہوئے جواریوں کی طرح ہم دونوں گھر لوٹ آئے۔ بدمعاملگی اور بددیانتی نے دونوں دلوں میں آگ لگائی تھی اور ہفتہ بھر ہم اسی آگ میں جھلستے رہے۔

اگلے اتوار کی شام کو ہم پھر انہی گلیوں میں پہنچے جہاں پچھلی بار ہماری معصومیت کو للکارا گیا تھا۔ آج نہ تو بدن پر کرتا تھا نہ منہ میں پان۔ ہاتھوں میں گجرے تھے نہ جیبوں میں سبز نوٹوں کی گڈیاں۔ ایک کوٹھے کی کھڑکی سے تین لڑکیاں باہر جھانک رہی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں ان کے چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکی نے مجید کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ ایک ادھیڑ عمر کی نیپالی ناک نقشے والی خوش طبع فربہ اندام عورت سامنے کمرے میں تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تینوں لڑکیاں اس کے پیچھے کھڑی ہنس رہی تھیں۔ میڈم سے سودا طے ہوا اور مجید اپنی پسند کی لڑکی کو لے کر بغل والے کمرے میں چلا گیا۔ میں میڈم کے پاس بیٹھا ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ میڈم میری طرف دیکھ کر بولنے لگی۔

''ماچس ہوگی آپ کے پاس؟''

''جی ہاں ماچس بھی ہے اور جلانا بھی آتا ہے''۔ میں نے جیب سے سگریٹ اور ماچس نکال کر دو سگریٹ ایک ساتھ سلگائے اور ایک سگریٹ میڈیم کو پیش کیا۔ میری اس ادا پر وہ مسکرائی۔ ''شاعر معلوم ہوتے ہو۔''

''شکل وصورت سے تو نہیں لگتا۔ البتہ ہر غم زدہ حساس انسان میں شاعر بننے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے۔''

''بڑے دلچسپ آدمی لگتے ہیں آپ''۔

''آپ کی ذرّہ نوازی ہے''۔

پھر وہ دوسرے گراہکوں سے مول تول کرنے لگی۔ کچھ وقفے کے بعد دس بارہ سال کا ایک چھوکرا چائے کا گلاس میڈم کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ میڈم نے جونہی گلاس ہاتھ میں اُٹھایا مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے میڈم کو ٹوک دیا۔

''اچھی مہمان نواز ہیں آپ۔ چائے منگوائی اور ہم سے پوچھا بھی نہیں''۔

''کیا آپ.....ہماری چائے پئیں گے؟ وہ تعجب سے پوچھنے لگی۔

''آپ نے پوچھ کرتو دیکھا ہوتا''۔

اس نے بلا جھجک اپنا گلاس مجھے پیش کیا اور اپنے لیے ایک اور گلاس کا آرڈر دے دیا۔ میں نے آنا کانی کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانی۔ اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ ابل پڑے۔ ''پی لیجیے، آپ کو ہماری قسم!''

میں اس کے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔ پہلی ہی ملاقات میں اتنا اپنا پن۔ میں حیران تھا۔ اس روز کے بعد میں ہر ہفتے اس کوٹھے کا طواف کرنے لگا۔ مجھے جسمانی بھوک مٹانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ میڈم سے کچھ ایسا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ ہفتے میں ایک دو بار دیکھے بغیر جینا مشکل ہو گیا۔ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی بے جا توقع نہیں تھی پھر بھی نہ جانے کیوں دونوں کو انتظار سا لگا رہتا۔

ادھر مجید جب بھی میرے ہمراہ آتا اسی لڑکی کو ڈھونڈ کر دیر تک اس کے ساتھ کمرے میں پڑا رہتا جس لڑکی سے وہ پہلے دن مل چکا تھا۔ پہلے پہل سودے بازی میں منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب رکھا جاتا تھا، بعد میں گھنٹے بھی گزر جاتے تو پتا بھی نہ چلتا۔ میڈم اور میری دوستی مجید کے لیے کارآمد ثابت ہوئی۔

میں زیادہ تر وقت میڈم کے پاس ہی اس کے نجی کمرے میں گذارتا۔ پہلے دن جب وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی تو مجھے اچنبھا ہوا۔ اس کا کمرہ گندگی اور غلاظت کے بیچ میں نفاست اور پاکیزگی کا جزیرہ تھا۔ دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ سامنے شلف پر تلسی رامائن اور ہنومان چالیسہ رکھے ہوئے تھے۔ شلف کے نیچے ہینگروں پر شوخ رنگوں کی کئی ساڑیاں لٹک رہی تھیں۔ کونے میں ایک میز پر ٹیپ کم ٹرانزسٹر بج رہا تھا۔ میک اپ کا سامان قرینے سے ایک چھوٹے سے طاقچے پر سجا ہوا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی میڈم نے شلف پر رکھی ہوئی اگربتیاں جلائیں۔ پھر دیوتاؤں کی

تصویروں کے سامنے کھڑے ہوکرمن میں منتروں کا جاپ کرنے لگی جس کا اندازہ اس کے ہونٹوں کی جنبش سے ہورہا تھا۔ جتنی بھی دیر وہ آنکھیں بند کئے کھڑی رہی اس دنیا سے بے خبر رہی۔ میں پورے سمئے اس کے پیچھے چپ چاپ کھڑا رہا۔ آنکھیں کھولتے ہی وہ پیچھے مڑی اور مجھے دیکھ کرزیرلب مسکرانے لگی۔ پھر چائے کی پیشکش کی۔ چائے کیا تھی خالص دودھ میں چائے کی پتی ڈالی گئی تھی۔ اتنی مزے دار کہ میں آج تک اس کا ذائقہ نہ بھول پایا۔

کئی مہینے اسی طرح گزر گئے۔ ایک روز مجید قدرے جلدی کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چہرے پر یرقانی کیفیت طاری ہوچکی تھی۔ چلتے چلتے میں نے مجید سے سوال کیا۔

''مجید بھائی، آج کیا بات ہے۔ آنکھوں میں یہ آنسو.....؟''

''کچھ نہیں یار۔ ایک پرابلم آن کھڑی ہوئی ہے۔''

''مجھے بھی بتاؤ آخر پرابلم کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی حل تو نکل ہی آئے گا۔''

''بات یوں ہے۔ (وہ رک کر بولا).....وہ لڑکی ہے ناوہ جس کے پاس میں ہمیشہ جاتا ہوں۔ اس کا نام نیلوفر ہے۔ وہ لوگ اس کو بمبئی بھیج رہے ہیں''

''آخر کیوں.....؟'' میں نے استفسار کیا۔

''وہ لوگ کسی بھی لڑکی کو ایک ہی جگہ پر بہت دیر تک نہیں رکھتے۔ ڈرتے ہیں کہیں کسی کے ساتھ میل جول بڑھا کر بھاگ نہ جائے یا پھر پولیس اور کسی والنٹری آرگنائزیشن کی مدد لے کر اپنے آپ کو بری نہ کروالے۔ انہیں لڑکی کھونے کی اتنی چنتا نہیں ہوتی جتنی کہ پولیس کے چھاپوں، اخباروں کی سرخیوں اور پھر کوٹ کچہری کے جھمیلوں کی۔ اتنا ہی نہیں، خریدار بھی آئے دن تنوع کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں۔ جب چہرے بدل جاتے ہیں تو وہ بھی نہیں اوبتے۔

''اوہ، تو یہ بات ہے۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

''یار، وہ کل ہی داور یکسپریس سے بمبئی جارہی ہے۔''

''پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''نیلوفر نے مجھے کل ریلوے اسٹیشن پر بلایا ہے۔ سخت تاکید کی ہے۔ میں نے ہامی تو نہیں بھری البتہ دلاسہ ضرور دیا ہے کہ کوشش کر کے آؤں گا۔''

''اب تمہاری مرضی کیا ہے؟'' میں نے کریدنے کی کوشش کی۔

''مرضی! تم میری مرضی پوچھ رہے ہو۔ میری تو زندگی میں طوفان آچکا ہے۔ نیلوفر اور میں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہنے لگے ہیں۔ ان پانچ چھ مہینوں میں اس نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو دس سال کی ازدواجی زندگی میں میری بیوی کبھی نہ دے سکی۔ میں اس کی آغوش میں سارے غم بھول جاتا ہوں۔ بارہا جی نے چاہا کہ اس کے گداز بدن پر سر رکھ کر ایسے سو جاؤں کہ پھر کبھی آنکھیں نہ کھلیں۔ وہ بھی میری محبت میں دیوانی ہو چکی ہے لیکن فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا''۔ مجید کے چہرے پر گرم گرم آنسو بہے جا رہے تھے۔

''اس میں ہرج ہی کیا ہے یار۔ ہم جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔'' میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

دوسرے روز ہم مقررہ وقت پر اسٹیشن پہنچے۔ دادر ایکسپریس پلیٹ فارم کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ دوسرے درجے کے سبھی ڈبے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ہم کھڑکیوں میں سے اندر جھانکتے رہے۔ کہیں کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یکایک مجید کی نگاہ ایک برقع پوش لڑکی پر پڑی جو ہاتھ ہلا ہلا کر اس کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔

ہم دونوں دوڑ کر نیلوفر کے نزدیک پہنچے۔ اس نے اپنی نقاب اُلٹ دی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ میں نے مجید کی جانب دیکھا۔ وہ بھی رو رہا تھا۔ کوئی کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہے تھے۔

دور سے ہری جھنڈی ہلنے لگی۔ گاڑی کی سیٹی بجی اور گاڑی حرکت میں آگئی۔ کہاں تو دونوں نے فیصلہ کیا تھا کہ بچھڑتے وقت اپنے دل کو کھول کر ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیں گے اور کہاں صورت حال یہ تھی کہ منہ سے ایک لفظ بھی نکل نہیں رہا تھا۔ گاڑی کی حرکت

محسوس کرتے ہی نیلوفر بڑبڑائی۔اس نے یکا یک مجید کا بازو اپنی طرف کھینچ لیا۔اور گرم تشنہ لبوں سے ہاتھ کی پشت پر بوسہ ثبت کیا۔

گاڑی کی رفتار تیز ہونے لگی۔

''خدا حافظ'' نیلوفر کے منہ سے بے تحاشہ نکل پڑا۔

''خدا حافظ'' مجید نے جواب دیا۔اس آواز میں میری آواز بھی شامل ہوگئی۔ پھر مجید پر نہ جانے کیسی وحشت طاری ہوگئی۔وہ دیوانہ وار گاڑی کے پیچھے دوڑتا رہا اور میری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔اسٹیشن پر میں بہت دیر انتظار کرتا رہا مگر مجید کی کوئی خبر نہ ملی۔میں اکیلے ہی گھر لوٹ آیا۔

اگلے کئی روز مجید اپنے آفس سے بھی غائب رہا۔کسی کو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔البتہ ایک مہینے کے بعد مجید کی آواز ٹیلی فون پر سنائی دی۔

''ارے تم! کہاں کھو گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''کہیں بھی تو نہیں۔اسی دنیا میں ہوں یار۔آگرہ سے بول رہا ہوں۔یہاں ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔تمہارے لیے خوش خبری ہے۔میں نے نیلوفر کے ساتھ کورٹ میں شادی کرلی ہے۔ہم کل واپس دہلی آرہے ہیں۔''

''کوئی لفڑا تو نہیں ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں ان کو چکما دے کر بھاگ نکلا۔انہوں نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی لیکن میں نے شادی کے رجسٹریشن کے کاغذات پیش کئے۔اس لیے وہ کچھ بھی نہ کرسکے۔البتہ کئی دنوں تک جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے رہے۔'' مجید کی آواز میں فاتحانہ گمک تھی۔

''سچ........!'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ٹیلی فون اچانک کٹ گیا۔اور میں ٹیلی فون کے رسیور کو دیکھتا رہا۔من ہی من میں مسکراتا رہا۔

☆☆☆

اچانک

''یہ سارے کیمپس میں ماتم سا کیوں چھایا ہوا ہے؟'' بس سے اُترتے ہی وہ اپنی سہیلی سے پوچھ بیٹھی۔

''تمہیں نہیں معلوم......؟''

سارا ماحول پر اسرار تھا۔

''نہیں تو......''

''کل تسنیم اہرہ بل کی آبشار میں ڈوب گئی''

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں سہلیاں بیچ کیمپس میں تصویر ماتم بن گئیں۔ پہلی لڑکی کی نظریں یونیورسٹی کے سب سے دلکش سنٹرل بلاک میں تسنیم کو یوں کھوجنے لگیں جیسے وہ وہیں کہیں چھپی ہوئی ہو۔

تسنیم ایم اے میں امتیازی پوزیشن حاصل کر کے 'اُردو ادب میں نسوانی کردار' پر ریسرچ کر رہی تھی۔

''ایسی نیک، حسین اور پاکباز لڑکی کو خدا نے اتنی جلدی اپنے پاس کیوں بلایا؟ کبھی کبھی مجھے اس کے انصاف پر شک ہونے لگتا ہے۔'' پہلی لڑکی گویا ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''انہی گتھیوں کو تو انسان سلجھا نہیں پاتا۔ مجھے بھی لگتا ہے کہ اوپر والے کے پاس اندھیر ہی اندھیر ہے۔ اور کچھ بھی نہیں''۔

''پوؤر گرل......! کتنے سپنے پالتی رہی۔ اب یہ کروں گی۔ پھر وہ کروں گی۔ سماج

کو تنزل سے بچانے کے لیے جنگ چھیڑوں گی۔ بہبودیٔ نسواں کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کروں گی۔ اقدار کی بحالی کے لیے جدو جہد کروں گی۔ سننے سے یوں لگتا تھا جیسے کاتبِ تقدیر سے اپنے لیے عمر خضر لکھوا کر لائی ہو۔ اور اب دیکھو...... شی از نو مور......!''

ڈل جھیل کے کنارے حضرت بل کی مشہور و معروف درگاہ سے متصل کئی ایکڑوں پر پھیلا ہوا یہ وسیع و عریض کیمپس سیبوں کے سینکڑوں اشجار سے مزین، آج بالکل خاموش تھا۔ اپریل مئی میں جب پیڑوں کی ڈالیاں شگوفوں سے آراستہ ہو جاتی تھیں تو سارے کیمپس پر شوخی، رنگینی اور رومانس کا سماں بندھ جاتا۔ اس نیچرل حسن کو شوخ رنگوں میں ملبوس چنچل دوشیزائیں، جو مہکتیں بھی تھیں اور چہکتیں بھی، چار چاند لگاتیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا تھا کہ ائیر فورس کا کوئی منچلا پائیلٹ بھنورے کی مانند اپنے ہیلی کاپٹر میں ان مہ پاروں کے اوپر فضائی طواف کر کے لطف اُٹھالیتا۔ لیکن آج تو سارا منظر ہی بدل چکا تھا۔ سارا کیمپس بیاباں بن چکا تھا۔

''یا خدا، نہ جانے رضوان پر کیا گزری ہوگی۔ بے چارہ تسنیم پر جان چھڑکتا تھا۔'' پہلی لڑکی پھر بولی۔

''اری، ہونا کیا تھا۔ وہ بھی تو اس کے ہمراہ تھا۔ بس مشٹنڈہ سا دیکھتا رہا۔ بڑا بنتا تھا ایتھلیٹ۔ پچھلے سال تیراکی میں انعام لیا تھا۔ اور دیکھو! تسنیم بے چاری ڈوبتی رہی۔ ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ مدد کے لئے چلاتی رہی اور وہ دیکھتا رہا۔ بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ دوسری نے جواب دیا۔

''کل تو میری طبیعت گڑبڑ چل رہی تھی۔ اس لیے ایکس کرشن پر جا نہیں پائی۔ تم نے تو سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ ہے نا؟''

''ہاں میں تو گئی تھی۔ میری بدنصیب آنکھوں نے تو سب کچھ دیکھ لیا۔'' دوسری لڑکی کی آواز رُندھ گئی۔

''ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ شاید خدا کی یہی مرضی تھی''۔ پہلی نے دلاسہ دیا۔ وہ اپنی

سہیلی کی جانب ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ کل دن کے سارے واقعات مجھے سناؤ۔

دوسری لڑکی تاڑ گئی۔ ہمت سمیٹ کر وہ سارا قصہ بیان کرنے لگی۔

''صبح آٹھ بجے ہم ایکسچینج سکوائیر سے یونیورسٹی بسوں میں روانہ ہوئے۔ سارے طلبا مرغانِ صبح کی طرح چہچہانے لگے۔ بسیں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی چلی گئیں۔ ایک دوسرے کی بات سننا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

تسنیم حسب عادت اپنے ہینڈ بیگ سے انگریزی ناول نکال کر پڑھنے لگی۔ رضوان نے اپنے دل میں نہ جانے کیا ٹھان لی۔ آ کر تسنیم کی بغل میں بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر جھلایا۔ وہ تسنیم سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتا تھا مگر تسنیم تھی کہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

پھر وہ شرارت پر اتر آیا۔

''معاف کرنا تسنیم۔ جب دیکھو تب ہاتھ میں کتاب لیے رہتی ہو۔ یہ بھی کوئی ٹائم ہے مطالعہ کرنے کا۔ آج تو کم از کم اس ناول کو بیگ ہی میں رہنے دو''۔

وہ مسکرائی۔ رضوان کا دل رکھنے کے لیے اس نے اپنی کتاب بند کر لی۔

''ہاں فرمائیے۔ کیا کہہ رہے تھے آپ؟''

''پچھلے اتوار کو تم پرائز ڈسٹری بیوشن فنکشن میں کیوں نہیں آئیں؟''

''مجھے کسی انعام کی توقع تھوڑے ہی تھی۔ پھر وہاں جا کر کیا کرتی۔ آئی ہیو نو انٹرسٹ ان اتھلیٹکس۔ کوئی خاص بات تھی کیا......؟'' وہ جان بوجھ کر انجان بنی رہی۔

''میں نے مانا تمہیں انعام نہیں لینا تھا مگر دوسروں کی حوصلہ افزائی تو کر سکتی تھی۔ معلوم ہے مجھے اس سال بھی تین انعامات سے نوازا گیا۔ دو تیراکی میں اور تیسرا لانگ جمپ میں۔''

''اور وہ بھی کانسی کے! کسی این ٹیک ڈیلر کی دوکان سے سستے داموں اُٹھا کر لائے ہوں گے'' اس نے چڑانے کے انداز میں کہا۔

''کیوں سونے کے تمغے کیانایاب ہو چکے ہیں اور تم کیا سمجھتی ہو کہ میں ان کے قابل نہیں ہوں''۔

''ارے نہیں نہیں۔تم تو خفا ہو گئے۔ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم گولڈ میڈل لے چکے ہو۔''

''تسنیم۔ سچ پوچھو تو ایک کمی ضرور محسوس ہوئی اور وہ تھی سراہنے والوں کی۔''

''اپنے کسی سیاست دان دوست کو کہا ہوتا۔ پے منٹ پر دو چار ٹرک تالیاں بجانے والوں کی بھیج دیتا۔''

''ارے ایسی کیا بات تھی۔ رضوان نے اگر ہم کو خبر دی ہوتی، ہم تو بغیر پے منٹ کے چلے آتے۔''بغل میں بیٹھی ہوئی شلکا نے ہنستے ہوئے کہا۔

سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی روشی نے شلکا کا کلام قطع کرتے ہوئے کہا۔''شلکا، کس کی باتوں میں آجاتی ہو۔ رضوان کا بس چلے تو ہم سے تالیاں بھی پٹواتا اور ہم سے ہی پے منٹ بھی کرواتا۔'' اس کی بات سن کر سبھی ہنس پڑے۔ روشی رضوان کو بہت چاہتی تھی مگر رضوان نے اس کو کبھی گھاس بھی نہ ڈالی۔ وہ من ہی من کڑھتی رہتی اور کبھی کبھار غیر ارادی طور پر تسنیم کو کوستی بھی رہتی۔

پام پور پہنچتے ہی گانے بجانے کا دور شروع ہوا۔ کئی طلباء اور طالبات نے اپنے جوہر دکھائے۔ محمد رفیع، مناڈے، مکیش، کشور، لتا اور آشا.... سب کے سب موجود تھے۔ ہم لوگ تالیاں بجاتے رہے۔ بسیں شور وغل سے گونج رہی تھیں۔

پھر یکا یک سومناتھ کھڑا ہو گیا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کرنے لگا۔''بھئی تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاؤ۔ میں آپ کو چٹکلا سنانے جا رہا ہوں۔''

قہقہوں کی بوچھار نے اس کا سواگت کیا۔ وہ شکل ہی سے جوکر لگ رہا تھا۔ ناٹے قد کا، گول مٹول جسم، اندر کو دھنسی ہوئیں آنکھیں جن پر گاندھیائی طرز کا موٹے فریم والا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ چپچپے بالوں کا اسٹائل ایسا تھا جیسے کوئی اٹھارویں صدی کا پروہت ہو۔

سومناتھ نے پہلا چٹکلا سنایا۔

زوردار قہقہوں سے بس پھر گونج اٹھی۔

دوسرا چٹکلا۔

قہقہے......!

تیسرا چٹکلا۔

پھر قہقہے.....!

اور پھر واپس جا کر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چند ہی ساعتوں میں اس کم گولڑکے نے ساری فضا میں قہقہے گھول دیئے تھے۔

کچھ لوگوں نے دنیا کو ہنسانے کا بیڑا اٹھایا ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتے ہیں۔

لگ بھگ بارہ بجے بسیں اہرہ بل پہنچ گئیں۔ سبھی طلبا و طالبات اپنی اپنی ٹوکریاں اور ٹفن اٹھائے اہرہ بل کی آبشار سے تھوڑی دوری پر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر سبزہ پر بیٹھ گئے۔ آبشار تھی کہ دل دہل جاتا تھا۔ فراز کوہ سے گرتی ہوئی پانی کی چادر نشیب میں سفید جھاگ کا انبار لگا رہی تھی۔ پس منظر میں نیلا آسماں اور کوہساروں کا ایک لامتناہی سلسلہ۔ بلندی سے پانی گرنے کی وجہ سے اتنا شور بپا تھا مانو کئی ساری کلیں ایک ساتھ چل رہی ہوں۔ بس کمی تھی تو کسی ورڈس ورتھ کی جو اس منظر کو الفاظ میں قید کر لیتا۔

پہلے چائے ناشتہ ہوا۔ پھر کھیل کود، ناچ گانا اور اس کے بعد لنچ۔ ٹفن کیا کھلے کہ ساری فضا کشمیری پکوان سے معطر ہوگئی۔ گشتابہ، رستہ، سیخ کباب، یخنی اور مرغ مسلم ایک طرف اور روغن جوش، کلیہ، کوفتہ، ندرو، ساگ اور دم آلو دوسری طرف۔ جو کچھ بھی تھا سامنے تھا۔ اور پھر سبھی مل بانٹ کر کھانے لگے۔ اس منظر کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انسان فرقوں اور جماعتوں میں بٹا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر ستانے کے بعد فلمی غیر فلمی گانوں کی محفل شروع ہوئی۔ روشی نے مہدی

حسن کی دو غزلیں سنائیں۔ تسنیم نے جگر کی ایک دلسوز غزل سنائی۔ کئی اور لڑکوں اور لڑکیوں نے بھی گانے گائے مگر خدا جانے کیوں سبھی گانے آنسو رُلانے والے تھے۔

میرا دل نہ جانے کیوں عجیب اندیشوں اور وسوسوں سے گھر گیا۔ آخر کیوں یہ سبھی لوگ پرانے دلسوز فلمی گانے اور غزلیں گا رہے ہیں؟ کیا وہ ہنسی خوشی کے گانے نہیں گا سکتے؟

''ہنسی خوشی تو غم کا ہی دوسرا پہلو ہوتا ہے۔ دراصل غم ہی زندگی کی حقیقت ہے۔ پھر اس حقیقت سے فرار کیوں؟'' میرے دل نے مجھے ٹوکا۔

''معلوم نہیں ہم لوگ ان ثانیوں کو بھی المناک کیوں بنا دیتے ہیں جنہیں کم سے کم ہنسی خوشی گزار سکتے ہیں؟'' میں نے اپنے دل میں ڈوب کر خود سے ہی سوال پوچھ لیا۔

''سچ تو یہ ہے کہ ان درد بھرے گیتوں میں جو مدھر سنگیت ہوتا ہے وہی ہم کو اصلی خوشی دیتا ہے۔ اسی لیے ہم اس سنگیت کی تلاش میں رہتے ہیں۔'' اندر سے آواز آئی۔

دریں اثنا سورج دھیرے دھیرے مغرب کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ چناروں کے سائے زمین پر ہر طرف پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ گرتے ہوئے پانی کی چادر اب قدرے سیاہی مائل ہو چکی تھی اور اپنے دامن میں اب بھی اتھل پتھل مچا رہی تھی۔ طلباء اور طالبات سبھی کھیل کود میں مگن تھے۔ وہ ٹھنڈے بہتے ہوئے شفاف پانی میں برہنہ پا اترتے، ہاتھوں سے رواں موجوں کو کاٹتے اور پھر ایک دوسرے پر پانی اچھالتے۔ کئی ایک بہتے پانی کی روانی کو نظر انداز کرتے ہوئے پاس ہی چٹانوں پر پھدکنے لگے۔''

وہ لڑکی جو راوی بن چکی تھی ایک دم چپ ہو گئی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آگے رونما ہوئے مناظر کو وہ کیسے بیان کر سکے گی۔ الفاظ اس کے گلے میں اٹک رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگے تھے۔ آخر کار اس نے ہمت بٹور ہی لی۔

''اتنے میں کہیں سے ایک چیخ سنائی دی۔ اور اسی چیخ کے ساتھ بہت ساری چیخیں نمودار ہو گئیں۔

''بچاؤ......بچاؤ......بچاؤ......!'' سبھی ایک دوسرے کو ملتجی نگاہوں سے دیکھ

رہے تھے۔ان کے چہرے لاچارگی کے اشتہار بن چکے تھے۔

تسنیم پانی کے ریلے کے ساتھ بہتی چلی جارہی تھی۔ وہ بے چاری ہاتھ پیر ہلا ہلا کر مدد کے لیے اشارے کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ ''بچاؤ، کوئی تو بچاؤ........یہ دریا مجھے نگل رہا ہے......!'' یہ اس کے اشاروں کی زبان تھی کیونکہ پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے وہ کچھ بھی بول نہیں پارہی تھی۔

سبھی طالب علم موجوں کی روانی دیکھ کر سر سے پیر تک کانپ رہے تھے۔صرف ایک دوسرے کو دیکھتے چلے جارہے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ بہتے دریا میں کود پڑے۔

سہمی ہوئی روشی رضوان کی جانب بار بار دیکھ رہی تھی۔ایک ایک کر کے سارے طلبا دریا کے کنارے خاموش کھڑے ہوگئے۔

اچانک پانی میں دھڑام سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔لوگ دیکھتے رہ گئے۔

سومناتھ پانی میں کود چکا تھا۔ اور کوشش کررہا تھا کہ تسنیم کے قریب پہنچے۔سومناتھ! جھینپو قسم کا ڈرپوک لڑکا، جس نے دریائے جہلم کے کنارے تیرنا سیکھا تھا مگر کسی دریا کے بیچ میں جانے کی کبھی جسارت نہیں کی تھی، موجوں سے سینہ سپر تھا۔

سومناتھ نے تسنیم کی انگلی پکڑلی اوراب بانہہ پکڑنے کی کوشش کررہا تھا۔دونوں پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے جارہے تھے۔اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

سومناتھ نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بے دھڑک ہاتھ پیر مار رہا تھا۔اس نے پھر تسنیم کی طرف آنے کی کوشش کی۔ بہت قریب پہنچ کر اس کے بائیں بازو کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ تسنیم میں اب اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ سومناتھ کی طرف اپنے آپ کو دھکیل دے۔ویسے بھی پانی کی وجہ سے وہ بھاری ہوچکی تھی۔ سومناتھ نے پھر زور لگا کر تسنیم کی کمر کو اپنی گرفت میں لینے کی بھرپور کوشش کی۔ پھر پانی کا ایک زوردار ریلا آگیا۔ سامنے مگرمچھ کی طرح منہ کھولے ایک بہت بڑا گرداب نمودار ہوا۔ اور دونوں اسی گرداب میں دھنستے چلے گئے اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔''

دونوں سہیلیاں آرٹس بلاک کے پاس پہنچ گئی تھیں جہاں طلباء اور اساتذہ کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو چکا تھا۔ کئی لوگوں نے خراج عقیدت پیش کیا۔ جنہوں نے وہ ہولناک منظر دیکھا تھا ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہہ رہے تھے۔ بولنے والوں کے حلق خشک ہو رہے تھے۔ وہ کچھ بول ہی نہیں پا رہے تھے۔ اسی بیچ ایڈمنسٹریٹو آفس کا ایک یونین لیڈر بشمبر ناتھ، جس نے اس حادثے کے بارے میں صرف سنا تھا مگر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، اسٹیج پر آیا۔ اس نے سارا قصہ دھرایا جیسے وہ خود اس واردات کا چشم دید گواہ ہو۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ حُسنِ خطابت سے سامعین یاسیت کے مجسمے بن گئے۔ تقریر کرتے ہوئے وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ اس کی یونین لیڈری اس کے انسانی جذبے پر غالب ہو گئی۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل کر ساری فضا میں گونجنے لگے۔

''سومناتھ کی عظیم قربانی سیکولرزم کی جیتی جاگتی مثال ہے''

دیکھتے ہی دیکھتے ایک عجیب سی بے چینی کی لہر سارے مجمع میں دوڑ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے بچھڑے ہوئے ان دو معصوموں کو موٹی سی گالی دی ہو۔

کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سومناتھ نے سیکولرزم کی مثال قائم کرنے کے لیے اپنی زندگی کا بلیدان دیا تھا۔ وہ ایک لمحے میں اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر چکا ہوگا؟ اس نے تو بس ایک معصوم بے بس لڑکی کو موجوں کے تلاطم میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دیکھا تھا۔ شدت جذبات سے وہ سوچے سمجھے بغیر ہی پانی میں کود پڑا تھا۔ ایک انسان کو موت کے چنگل سے بچانے کے لیے!

یونین لیڈر کی آواز نشتر بن کر دونوں مقدس روحوں کو زخمی کر چکی تھی۔



بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب

شلپی اور بھاسکر اسٹیج کی بدولت ہی ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ڈائریکٹر شوچرن رستوگی نے اپنے تازہ ترین ڈرامہ 'جنگجوؤں کے ساتھ ایک رات' کے لیے شلپی اور بھاسکر کو چنا تھا اور دونوں اپنا اپنا رول نبھانے میں کامیاب ہوچکے تھے۔

ایک روز ڈرامہ رہرسل کے دوران تھوڑی سی فرصت پاکر بھاسکر نے ہمت جتائی اور شلپی کو پاس ہی ریستوران میں کافی پینے کی دعوت دی۔ حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ شلپی نے، جو کم گو، دروں بین اور تجرد پسند تھی، بلا تامل رضامندی ظاہر کی اور لومڑی کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

''تم اتنی کھنچی کھنچی سی کیوں رہتی ہو؟ تمہاری خاموشی سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم گھمنڈی ہو'' گفتگو کا دائرہ نجی زندگی کو چھونے لگا۔

''مجھے بھیڑ سے وحشت ہوتی ہے، خلوت ہی میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہ بے ہودہ ہنسی مذاق، فضول بکواس ایک دوسرے کی چغلیاں۔ کیا ملتا ہے ان سب سے؟''

''ملتا کیا ہے؟ دوسروں کو خوش کرنا اور ان کے ساتھ خوشیاں بانٹنا۔ اس سے بڑھ کر زندگی کا کون سا مقصد ہوسکتا ہے۔''

''یہ کام جوکروں کا ہوتا ہے۔ تمہارا ہوسکتا ہے۔ میرا نہیں۔'' شلپی کا چہرہ سنجیدہ ہوچکا تھا۔

''تمہیں میں جو کرد کھائی دے رہا ہوں؟''

''اور کیا۔تم دراصل اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔دوسروں کی خوشی تمہارا نصب العین نہیں ہے بلکہ تم اپنی آسودگی ڈھونڈ رہے ہو۔تم اپنی زندگی غیر سنجیدگی سے اس لیے بسر کر رہے ہوتا کہ تمہیں اس اتھاہ سمندر کے درون میں اُٹھ رہی لہروں کا احساس ہی نہ ہو۔ تم فراریت پسند ہو اور کچھ نہیں۔''

''یہ سراسر بہتان ہے۔تہمت ہے مجھ پر''

''بھاسکر۔اپنے ماضی پر ذرا غور کرو۔کتنی لڑکیوں کو چاہا ہے تم نے۔آج تک کتنوں سے محبت کی ہے۔اور پھر انجام کیا ہوا۔ایک ایک کر کے بچھڑتی رہیں۔اپنے دلوں پر کاری ضرب لیے اور تم سوچتے رہے کہ تم خوشیاں بانٹتے رہے۔کیا تم ان کے گداز جسموں سے لذت کے طلب گار نہیں تھے؟ کیا تم ان کے بدن کو چاٹ چاٹ کر مسرت نہیں ڈھونڈ رہے تھے؟''

''شلپی ۔تم غلط سوچ رہی ہو۔میں نے یہ مان لیا کہ میری زندگی میں بہت ساری لڑکیاں آئیں مگر میں نے کسی سے کوئی زبردستی نہیں کی۔جھوٹے وعدے نہیں کیے۔زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملائے۔ان کو جھوٹی محبت کا واسطہ نہیں دیا۔جتنی لڑکیاں میری زندگی میں آئیں وہ سب آنکھیں کھولے آئیں بند کر کے نہیں۔انہیں میری زندگی اور میرے اسٹائل کا بخوبی علم تھا۔انہیں آغاز سے پہلے انجام کی خبر تھی۔میں نے کسی کو بھی ایکسپلائیٹ نہیں کیا۔وہ سبھی خوشی کے ان لمحوں کی متلاشی تھیں جو انہیں مجھ جیسے لذت پرست آدمیوں سے ہی مل سکتے تھے۔''

''اور خود۔تمہیں کیا ملا۔؟''

''خود مجھے۔؟ مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔میں تو بس اپنی کلا کا پجاری ہوں۔میری زندگی کا مقصد تو صرف میرا آرٹ ہے۔اور کچھ بھی نہیں۔باقی سب لایعنی ہے۔زندگی میں ان سب کا ثانوی رول ہے۔میری زندگی کا بس ایک ہی مدعا ہے کہ ایک دن میں خود ایسا

ڈرامہ لکھ کر اسٹیج پر پیش کروں جس کو دیکھ کر لوگ عش عش کریں۔"

"اس ڈرامے میں میرا کیا رول ہوگا۔"

"ایکسٹرا کا"۔ بھاسکر نے سوال کو مذاق میں ٹال دیا مگر شلپی کو اپنے سوال کا غیر ارادی طور پر جواب مل گیا۔ اس کے باوجود اس کو بھاسکر سے ہمدردی ہوئی۔ حالانکہ بھاسکر ایک لاابالی قسم کا آدمی تھا جو زندگی کو کبھی متانت سے جی نہ سکا تب بھی شلپی اسے پیار کرنے لگی اور اس کے کالے بالوں سے بھرے ہوئے سینے پر اپنے گال سہلاتی رہی۔

وقت گزرنے کے ساتھ شلپی کی خواہشیں شدید تر ہونے لگیں۔ ایک روز وہ رہرسل کے دوران بھاسکر سے مخاطب ہوئی۔

"رہرسل کے بعد کوئی ڈیٹ تو نہیں ہے بھاسکر"

"ہاں، تین بہنوں کے ساتھ اکٹھے ڈنر کا پروگرام ہے۔ کیا معلوم کس وقت کون کام آئے۔" بھاسکر نے قہقہہ لگا کر اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

"ان تین میں ایک اور لڑکی شامل ہو تو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔" شلپی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں البتہ ان کو ضرور ہوگا اور پھر ہندوستان میں اتنی ترقی تو ہوئی نہیں کہ ایک گھر کی لڑکیاں کسی پرائی لڑکی کو اپنے محبوب کے ساتھ برداشت کرلیں"۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں جاؤ گی ڈارلنگ۔ میں تو بس یوں ہی دل لگی کر رہا تھا۔ چلو آج روز ڈیل میں ڈنر ہو جائے۔"

"دیٹ وِل بی گریٹ۔ پھر سمندر تٹ پر دیر رات تک ٹہلیں گے"۔ شلپی، خوشی سے جھومنے لگی۔

رہرسل کے بعد دونوں چل دیئے۔ شلپی بھاسکر کے ساتھ سائے پہلے ڈنر، پھر سمندر کے ساحل کی نرم نرم ریت پر ننگے پاؤں ٹہلتی رہی،

مضبوط بانہوں میں رات بھر جھولتی رہی۔ ساری رات وہ بھاسکر کو اپنے جسم کے ہر مسام میں سموتی رہی کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ بھاسکر سورج نکلتے ہی بلبلے کی مانند بھاپ بن کر اُڑ جائے گا اور وہ دیکھتی رہ جائے گی۔ خوشی کی یہ پر بھاشا بھی ہو سکتی ہے اسے معلوم نہ تھا۔

اسٹیج کی وجہ سے بھاسکر کے لاکھ جتن کے باوجود وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہو سکے۔ بھاسکر شلپی کی زندگی میں رنگ بھرتا رہا اور خود کو فراموش کرتا رہا۔

وقت کو جیسے پر لگ گئے۔ شلپی پورا ہفتہ غائب رہی۔ بھاسکر سے رہا نہ گیا۔ سیدھے شلپی کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں شلپی کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اسے حالات کا اندازہ خود بخود ہو گیا۔

بھاسکر کو دیکھتے ہی شلپی کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی نظریں حیا سے جھک گئیں۔

''کیوں.... ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہے ہو۔'' شلپی نے بغیر نگاہیں ملائے سوال کیا۔

شلپی کو دیکھ رہا ہوں۔'' بھاسکر کے لہجے میں تردد اور فکر مندی تھی۔

''شلپی تو سچ مچ ہی تخلیق کرنے لگی ہے۔ بھاسکر! ایک نیا وجود پلنے لگا ہے اس کے اندر۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' شلپی نے غیر ارادی طور پر اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''حمل گروا دو''۔ بھاسکر نے رکھائی سے مشورہ دیا۔

''بھاسکر! تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اتنے نردئی نہ بنو۔ میں تمہارے نظریۂ حیات سے باخبر ہوں۔ تاہم مجھے نہ جانے کیوں یقین سا ہو گیا کہ شاید تم میرا دل رکھنے کے لیے کچھ اور ہی کہو گے۔'' شلپی کے لہجے میں توقع تھی، امیدواری تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ شلپی! تمہیں تو معلوم ہے کہ میں زندگی میں اکیلا رہنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے کسی بھی چیز کے ساتھ زیادہ دیر جڑے رہنے سے کوفت ہوتی ہے۔'' بھاسکر نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

''تجرد پسند تو خیر میں بھی ہوں۔ مگر عورت کی کوکھ جب سنسناتی ہے تو وہ اپنا وجود ہی بھول جاتی ہے۔ ویسے تو بھاسکر میں نے تمہیں بلایا بھی نہیں۔ تم خود ہی چلے آئے۔ مجھے تو تمہارے آنے کی توقع بھی نہ تھی۔ تمہارا جواب سن کر مجھے کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ مگر میں اسقاط حمل کے حق میں نہیں ہوں۔ یہ میرے پہلے پیار کی پہلی نشانی ہے۔ میں اس ننھے وجود کو عمر بھر سینے سے لگا کر جینا چاہتی ہوں چاہے تم میرے ساتھ رہو یا نہ رہو۔'' شلپی نے ہمت جٹا کر اپنا فیصلہ سنایا۔

''شلپی پاگل مت بنو۔ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں پھر بھی یہی رائے دوں گا کہ تم کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے اسقاط کروالو۔ باقی جو تمہاری مرضی۔'' بھاسکر نے پلٹ کر جواب دیا۔

بھاسکر ایسے چلا گیا کہ پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ خدا جانے اس کو کیوں ڈر سا لگنے لگا تھا۔ شلپی پہلی لڑکی تھی جو اس کو کمزور بنانے کے درپے تھی۔ اس کو خدشہ تھا کہ کہیں شلپی اُس بچے کی آڑ میں اُسے اپنے جال میں پھنسا نہ لے۔

انسان کو سب سے زیادہ ڈر اس وقت لگتا ہے جب اس کی کمزوریاں بے نقاب ہو جاتی ہیں اور اس کے چہرے پر چڑھا ہوا خول اتر جاتا ہے۔

اِدھر بھاسکر شہر چھوڑنے پر مجبور ہوا اور اُدھر شلپی نے جو بچہ جننے کی ٹھان لی تھی اس پر دوبارہ سوچ بچار کیا۔ جنون میں لیا گیا فیصلہ کبھی بہت مہنگا پڑتا ہے۔ سہیلیوں سے مشورہ کر کے اسے یہ احساس ہوا کہ بھارتیہ سبھیتا اس بات کی کبھی اجازت نہیں دے گی کہ تم اپنے بچے کو ایک نارمل زندگی دے سکو۔ اس کو زندگی کے ہر موڑ پر طعنے سننے پڑیں گے۔ ہر مرحلے پر کٹھنائیاں اٹھانی پڑیں گی۔ اور پھر جب وہ بچہ تم سے سوال کرے گا۔ ''ماں تم کو مجھے اس حالت میں وجود میں لانے کا حق کس نے دیا تھا؟'' تو تم کیا جواب دو گی؟

اسی افراتفری میں شلپی نے حمل گروا دیا اور پھر اپنے تھیٹر کے کام میں جی جان سے جٹ گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس کے کردار میں اندر کا کرب جھلکنے لگا جس کے سبب

اس کی ایکٹنگ میں کافی نکھار آ گیا۔

شلپی نے کئی سال نئے نئے اداکاروں کے ساتھ مختلف رول نبھائے حالاں کہ ان میں وہ بات نہیں تھی جو بھاسکر میں تھی۔ ان کے باہمی تعلقات بالکل تجارتی سے ہوتے۔ وہ پیار کا جواب پیار سے اور نفرت کا جواب نفرت سے دینے لگی۔ وہ اب اپنی اینٹری اور ایگزٹ سے باخبر تھی اور کبھی چوکتی نہ تھی۔

اپنی پہلی تخلیق کے ضائع ہونے کے غم نے شلپی کو حساس اور جذباتی بنایا تھا۔ اس کی اداکاری میں ایک نکھار اور میچورٹی آ چکی تھی۔ اس کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ یہاں تک کہ ممبئی کے ایک فلم پروڈیوسر نے اسے اپنے نئے فلم میں لانچ کرنے کی دعوت بھی دی۔ شلپی کو اپنی قابلیت اور اپنی اداکاری پر کبھی کوئی شک نہیں تھا البتہ ایسا آفر ملنے کا اس نے کبھی خواب میں بھی سوچا نہ تھا۔ شلپی نے ہامی بھرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کی۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ جس جگہ وہ جا رہی تھی وہاں پچھلے تین سال سے بھاسکر اپنی شناخت بنانے میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

شلپی کے بڑے بڑے پوسٹر، سنیما گھروں میں لگے ہوئے اشتہار اور میگزینوں میں چھپی تصویریں بھاسکر کے دل میں ایک طوفان کھڑا کرنے کے لیے کافی تھیں۔

وہ اپنے بیتے ہوئے دنوں کا تجزیہ کرنے لگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا اس نے اپنا مدعا پا لیا یا نہیں۔ مڑ کر جو دیکھا تو سب کچھ سنسان سا لگ رہا تھا۔ پچھلے کئی برسوں میں اس کا زیادہ تر وقت روزگار کی تلاش میں صرف ہوا تھا اور ابھی تک وہ کہیں پر قدم جمانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اپنی آئڈیل تخلیق کا تو سوال ہی نہیں یہاں تو زندگی گزارنا بھی دو بھر ہو گیا تھا اور خاص کر ایسی دنیا میں جہاں نوے فیصدی سے زیادہ لوگ ناکام رہتے ہیں۔ بس چند ایک کلاکار ہی اپنا لوہا منوا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہنر، سرمائے اور جان پہچان کی ضرورت ہوتی ہے۔ باقی ماندہ تو گلیوں کی خاک چھانتے ہوئے دم توڑ دیتے ہیں۔

اپنی پہچان بنانے کے لیے وہ انتظار کرتا رہا لیکن چہرے پر نمودار ہوئی جھریوں نے

اسے بے چین کر دیا۔ اس کو اپنی تخلیق کی یاد آئی۔ اور کھلے بازوؤں سے اس کو اپنانے کے لیے دوڑ پڑا۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے بھاسکر۔ یہ سفید بال، یہ چتکبری داڑھی، یہ پوشاک اور پھر بیڑی پر بیڑی پینا......تم کہیں اپنے آپ کو کنزیوم تو نہیں کر رہے ہو۔ خیریت تو ہے'' بھاسکر کا وجود شلپی کے ڈرائنگ روم میں مخمل پر ٹاٹ کے پیوند سا لگ رہا تھا۔

''ہاں خیریت ہی سمجھو۔ شلپی! کئی مہینوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں پر ہمت ہی نہیں ہوئی۔ بار بار اپنے آپ کو ملامت کرتا رہا۔ اپنی نظروں میں گرتا رہا۔ اس لیے اپنے آپ کو سنبھال نہیں پایا۔ مگر اب مجھ سے رہا نہ گیا۔''

نوکرانی سامنے میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر چلی گئی۔

''تم نے بہت اچھا کیا جو تم چلے آئے۔ تمہاری صورت سے ایسے لگ رہا ہے جیسے تم اپنے آپ کو فریب دے رہے ہو۔ زندگی کی سچائی کو اپنانے سے ہی آدمی کو نجات مل سکتی ہے۔ ورنہ تو روح ہمیشہ پھڑ پھڑاتی رہے گی۔ چائے پی لو ٹھنڈی ہو جائے گی۔ میں ذرا سکریٹری کو کچھ ہدایتیں دے آتی ہوں۔''

بھاسکر نے پھر ایک بیڑی سلگائی اور چائے کے گھونٹ سِپ کرنے لگا۔

''وہ جس کو کچھ بھی کرنے کی خواہش نہیں تھی۔ اس نے تو اپنی ساری مرادیں پالیں۔ اور میں ہوں کہ ایک خواہش بھی پوری نہ کر سکا۔ کس کو دوش دوں۔ لگن کی کمی کو بدنصیبی کو یا پھر اپنے نظریۂ حیات کو'' بھاسکر فکر و تردّد میں پڑ گیا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آئیڈیلسٹ اپنا آئیڈیل پائے بغیر ہی اس دنیا سے سدھار جاتے ہیں کیونکہ ان میں عملی زندگی کا فقدان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو ہواؤں کے رخ پر اپنی ناؤ چھوڑتے ہیں ساحل تک پہنچ جاتے ہیں۔

شلپی ڈرائنگ روم میں واپس چلی آئی اور بھاسکر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

''تم نے تو اپنی تخلیق مکمل کر لی ہوگی۔ میں تو اس دن کا بے صبری سے انتظار کر رہی

ہوں''۔

''وہ تخلیق اب نہیں بن پائے گی۔ شلپی! میں ٹوٹ چکا ہوں۔ بکھر چکا ہوں۔ اب میرے اندر کسی بھی تخلیق کی کوئی تمنا نہیں۔''

''پھر!''

''میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے پاس میری تخلیق امانت ہے۔ اگر تم مجھے غلط نہ سمجھو تو میں اسے اپنانا چاہتا ہوں۔''

شلپی سنجیدہ ہوگئی۔ اس کے سامنے سارا منظر گھومنے لگا۔ پرائیویٹ نرسنگ ہوم، سفید یونیفارم میں ملبوس ڈاکٹر اور نرسیں اور پھر بے ہوش کرنے والی وہ ماسک۔ اس ٹیبل پر وہ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ کھو چکی تھی۔ اس کے بدن میں جھُرجھری سی دوڑ گئی۔

''بھاسکر! تم نے بہت دیر کردی۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہاری امانت کو میں بہت کوشش کے باوجود بھی سنبھال نہ سکی۔ مجھے اس کے وجود میں آنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس لیے اس کی تضیع میں ہی اپنی خیر سمجھی۔ آخر کار بہت ڈرپوک ثابت ہوئی۔

''وہاٹ.....!'' بھاسکر کے سر پر بجلی سی کوند پڑی۔

''ہاں.... میں نے اسقاط کروالیا''۔

''اوہ نو۔ یہ تم نے کیا کرلیا... شلپی!''

''میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ تم تو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ تمہارے واپس آنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ ویسے بھی تم مرد لوگ ایسے ہی ہو۔ عورت کو لاچار سمجھ کر اور اس کے جذبات سے کھیل کر اپنے ہوس کا کھلونا بنا لیتے ہو۔ بعد میں اس کو بے سہارا اور بے بس منجھدار میں چھوڑ دیتے ہو۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں اب تمہارا کھلونا بننا نہیں چاہتی۔ میں سارا قصور مردوں پر ہی لادنا نہیں چاہتی۔ سچ تو یہ ہے کہ عورتیں بھی اپنی اس تذلیل کی

خواہاں ہوتی ہیں۔ شاید اگر میں نے اپنی الگ راہ نہ ڈھونڈلی ہوتی تو آج تم میرے سامنے فریادی بن کر نہ بیٹھے ہوتے بلکہ میں تمہارے پاؤں پڑکر گڑگڑاتی، آنسو بہاتی اور اپنے پیار کا واسطہ دیتی۔

بھاسکر اپنی ناکامیوں کے تلخ گھونٹ چائے کے ساتھ حلق میں اُتارتا چلا جارہا تھا۔ اُسے اب یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے کتنے کپ پی لیے تھے۔

''میڈم آپ کی کار باہر کھڑی ہے۔ اپائنٹ منٹ ساڑھے نو بجے کی ہے۔ صرف دس منٹ رہ گئے ہیں''۔ شلپی کا شوفر اس کے سامنے کھڑے ہوکر کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتی ہوں''۔ اور پھر وہ بھاسکر سے مخاطب ہوئی۔ ''لیٹ اُس ہری اپ، بھاسکر''

بھاسکر آہستہ سے اٹھا۔ شلپی تو پہلے ہی سے کھڑی ہوچکی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے پر ایسے نظر ڈالی جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ دھیرے دھیرے دونوں اپنے راستوں پر سفر کرنے کے لیے صدر دروازے سے باہر نکل گئے۔



یہ ساغر، شیشے لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں لہو رلواتے ہیں
(نامعلوم)

ریزے

''راکیش.....! یہ سب کیا ہورہا ہے؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہی ریکھا نے سوال کیا۔

''اپنی بے ترتیب زندگی کو ترتیب دے رہا ہوں۔'' راکیش نے مڑکر جواب دیا۔ ہڑبڑاہٹ میں اس کے ہاتھوں سے کتابیں پھسل کر فرش پر بکھر گئیں۔ پاس ہی میز پر رکھا ہوا ٹیبل لمپ بھی لڑھک کر زمین پر گر پڑا۔ بلب ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔

''کہیں ان کتابوں کی طرح بکھر ہی نہ جائے۔ کئی دنوں سے میری دائیں آنکھ پھڑک رہی ہے'' ریکھا اپنے مخصوص نصیحت آموز لہجے میں گویا ہوئی۔ لیکن راکیش نے سنی ان سنی کردی اور جھک کر فرش پر بکھری ہوئی کتابوں کو سمیٹنے لگا۔ ریکھا اُلٹے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔

کتابوں کے بعد کرچیوں کی باری آ گئی۔ جونہی راکیش ان ریزوں کو سمیٹنے لگا ایک نوکیلی کرچی اس کی انگلی میں تیر کی مانند چبھ گئی۔ ہاتھ سے خون بہنے لگا مگر منہ پر تالے پڑ گئے۔ جی چاہتا تھا کہ ریکھا کو آواز دے مگر اس کی اَنا سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

''اب جو کچھ بھی کرنا ہوگا اپنے بھروسے ہی کرنا پڑے گا۔ دست نگری سے کوئی فائدہ نہیں''۔ راکیش نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

فرش پر بکھرے ہوئے ریزے راکیش کو ایسے گھور رہے تھے جیسے اس کا مضحکہ اڑا رہے ہوں۔

''واہ، واہ..... یہ خودداری! کیا بات ہے۔ راکیش، ہماری جانب دیکھو۔ ابھی چند لمحے

---

* یہ افسانہ دوردرشن سرینگرنے 'ایک کہانی' پروگرام کے تحت ۱۹۷۵ء کے آس پاس ٹیلی وائز کیا تھا۔

پہلے ہم ثابت وسالم تھے۔ کتنی قدر تھی ہماری۔ ہم تمہاری تاریکیوں کو مٹاتے تھے اور تم نے ہمیں سر پر بٹھا رکھا تھا۔ مگر اب......! اب ہم بکھر چکے ہیں۔ ہمارا وجود بکھر چکا ہے۔ اب ہم کسی لائق نہ رہے۔ اب تم..... ہاں تم.... ہمارے مالک....... ہمیں اُٹھا کر پھینک دو گے۔ ہم اس انجام سے باخبر ہیں۔ اٹھاؤ ہمیں اور پھینک دو۔ نیچے کوڑے دان میں۔ ہم ریزے ہیں ریزے۔ بے کار ریزے۔''

راکیش کرچیوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ اندر سے ایک آواز اُبھر آئی۔ ''نہیں نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اپنی زندگی کو پارہ پارہ ہونے نہیں دوں گا۔ میں اپنا مستقبل خود ہی سنواروں گا۔ تم میری چنتا چھوڑ دو۔'' کرچیاں اکٹھا کر کے راکیش نیچے اُترا اور پھر ان کو میونسپل کمیٹی کے کوڑے دان میں پھینک کر لوٹ آیا۔

چند دنوں میں راکیش کا استعفیٰ منظور ہوا۔ پہلے پہل تو راحت سی محسوس ہوئی۔ پھر ہر گھڑی بوجھ بنتی گئی۔ شاید وہ غیر محفوظ مستقبل سے گھبرانے لگا تھا۔

''راکیش، تمہیں ایسا فیصلہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے باہر بے روزگاروں کی قطاریں کبھی دیکھی ہیں کیا؟ رزگنیشن، رزگنیشن، مائی فُٹ۔ کیا کرو گے اب؟ اچھی بھلی نوکری تھی۔ کلرک تھے تو کیا ہوا۔ آخر ترقی کے راستے بند تو نہ تھے۔ وہیں پر یوڈی سی بن جاتے، پھر سپروائزر اور پھر ہو سکتا ہے افسر بھی بن جاتے۔ ایسی مصیبت مول لینے سے کیا ملا؟ اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' جھنجھلاہٹ میں نہ جانے ریکھا کیا کچھ بولتی گئی لیکن راکیش ان نشتروں کے وار سہتا رہا۔

''مجھے آگے تعلیم حاصل کرنی ہے۔ آئی وانٹ ٹو اسٹڈی فردر''۔

''اسٹڈی! مائی فُٹ! جب پڑھنے کا ٹائم تھا تب ہمارے کالج کے باہر لڑکیوں کا بائیوڈاٹا جمع کرتے رہے۔ دو بار بی کام میں فیل ہوئے۔ بھگوان کا شکر ہے کہ بی کام کلیئر کر سکے۔ انکل نہ ہوتے تو نوکری کہاں سے ملتی۔ آج کل ایم بی اے اور پی ایچ ڈی کی

ڈگریاں لے کر بھی لوگ سڑکوں پر بے روزگار پھرتے رہتے ہیں۔ اور تم ہو کہ......" اس نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ یہ نشتر زنی تو اب روز کا معمول بن چکا تھا مگر آج راکیش ایک لفظ بھی برداشت نہ کر پایا۔ وہ نڈھال ہو چکا تھا۔ چار سال پہلے جب راکیش نے بھری بس میں ریکھا کے لیے اپنی سیٹ خالی کی تھی اس وقت ریکھا ایسی سخت جان نہیں تھی۔ مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی وہ اپنی ساڑی کے پلّو کو سمیٹتی ہوئی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اور کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے اس نے راکیش کا شکریہ ادا کیا تھا۔ دو دلوں کو جوڑنے کے لیے وہ ایک ملاقات ہی کافی تھی۔ ریکھا ان دنوں پوسٹ گریجویشن کر رہی تھی جبکہ راکیش اسٹیٹ فارسٹ ڈیپارٹمنٹ میں لوور ڈویژن کلرک تھا۔ ان دنوں کی بے فکری راکیش کو پل پل ستانے لگی۔ اس کو ریکھا کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

"ریکھا، اس سفر بے سنگ میل کا انجام تم نے کبھی سوچا بھی ہے؟" ایک روز راکیش نے کریدنے کی کوشش کی تھی۔

"اس میں سوچنا ہی کیا؟ میں اور تم اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ دوست ہی رہیں گے۔"

"دوست، اور کچھ بھی نہیں؟"

"کیا دوست ہونا کافی نہیں ہے؟"

"پر یہ رشتہ۔! یہ انہونا رشتہ تو ہمارے سماج کو منظور نہیں۔"

"کیوں نہیں، میں دراصل شادی کے خلاف ہوں۔ آزاد پنچھی کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ آئی وانٹ ٹو انجوائے مائی لائف۔ میں ساری دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔ مغربی سیلانیوں کی مانند۔ جھول نکالنے والی مرغی نہیں بننا چاہتی۔ اس دھرتی سے اور بچوں کا بوجھ نہیں سہا جائے گا۔"

"اس اسکیم میں میرا کیا رول ہوگا؟"

"تمہارا رول۔ تم بھی آزاد ہو۔ اور ہمیشہ آزاد رہو گے۔"

"ریکھا، مجھے تو تمہارے ان ترقی پسند خیالات سے کبھی کبھی اُلجھن سی محسوس ہونے

لگتی ہے۔''

''اس میں الجھن کی ایسی کون سی بات ہے۔ اگر تمہیں میری سوچ وفکر سے اتفاق نہیں ہے تو تم اپنا کوئی الگ راستہ چن لو'۔

راکیش کو اس بات کا احساس تھا کہ اتنا قریب آ کر وہ ریکھا کی جدائی برداشت نہیں کر سکے گا۔ حالانکہ اس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آ کر جا چکی تھیں۔ مگر ریکھا میں کچھ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اس کے دل ودماغ پر چھا گئی۔ وہ ریکھا کے ان الفاظ کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی گیا۔

پھر اچانک ایک دن سب کچھ بدل گیا۔ ریکھا ایم اے مکمل کر کے کالج میں لکچرار بن گئی۔ اس کی کوکھ بھی بچے کے لمس کے لیے تڑپنے لگی۔ ہر عورت کی زندگی میں ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اس کی ممتا جاگ اُٹھتی ہے۔ اس کے کان 'ماں' کا شبد سننے کے لیے ترسنے لگتے ہیں۔ اس کی چھاتیاں ملائم بے دانت مسوڑھوں کی چسنی بننے کے لیے درد کرنے لگتی ہیں اور تب اس کو اپنے اوپر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔

''راکیش، تمہیں نہیں لگتا کہ اب وقت آ گیا ہے۔''

''کاہے کا؟''

''ہم دونوں کا شادی کے بندھن میں بندھ جانے کا۔''

''شادی۔! ریکھا، تم ہوش میں تو ہو نا۔''

''ہاں سچ کہہ رہی ہوں۔ اب میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ مجھے راتوں کی تنہائی کھانے کو دوڑتی ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے سپنے آتے رہتے ہیں۔''

''مگر میں۔ میں نے تو شادی کا خیال ہی ترک کیا ہے۔ میں اب اپنا کیریئر بنانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ میں اپنے حال سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ اس لیے آئی وانٹ اے چینج۔ تم مجھے شادی کرنے کے لیے مجبور نہ کرو۔''

پھر بھی ریکھا کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور ایک روز کورٹ کے رجسٹر میں دونوں

کے نام درج ہو گئے۔

شادی کے بعد کی زندگی دونوں کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ دونوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے ایک دوسرے کی آزادی پر آہنی بیڑیاں ڈال دی ہوں۔ ہماری زندگیوں کو تراشنے میں اردگرد کے ماحول کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر یہ ماحول سازگار نہ ہو تو عجیب سی گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ عورت ہونے کے سبب ریکھا نے ماحول سے کب کا سمجھوتا کر لیا تھا مگر راکیش کچھ بھی طے نہیں کر پا رہا تھا۔ آخر اس فیملی میں اس کی کیا اہمیت تھی۔ ریکھا اس سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ لکچرار تھی۔ زیادہ کماتی تھی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اس کی سانسیں بھی ریکھا کے رحم و کرم پر منحصر تھیں۔

''ہیلو ریکھا، ویل کم۔ یہ شاید آپ کے ہسبنڈ ہیں''

''گڈ مارننگ۔ آپ ریکھا جی کے پتی ہیں نا۔ ہمیں معلوم ہے آپ کو اس دن پارٹی میں دیکھا تھا۔''

''نمستے بھائی صاحب! لگتا ہے ریکھا جی آپ کا بالکل ہی خیال نہیں رکھتی ہیں۔ آپ بہت کمزور ہو چکے ہیں۔''

ریکھا..... ریکھا....... ریکھا۔ جدھر دیکھو ادھر ریکھا۔ اور خود راکیش ایک ضمیمہ بن کر رہ گیا تھا۔ اسی کرب سے راکیش چھٹپٹا رہا تھا اور فرار کی تاک میں بیٹھا تھا۔

''نہیں، اس زندگی سے سمجھوتا کرنا ہی عقلمندی ہے۔ تمہیں اپنے اور ریکھا کے مرتبے کا پہلے ہی سے علم تھا۔ تم نے سوچ سمجھ کر اس دائرے کے اندر قدم رکھا۔ پھر یہ فرار کس لیے؟'' راکیش کا درون ملامت کرتا۔

''میں اپنی تضحیک کا آلہ خود ہی بننا نہیں چاہتا۔ ریکھا نے میرے وجود کا پورا احاطہ کر لیا ہے۔ مجھے اب آزادی سے سانس لینے کا بھی حق نہیں ہے۔ میں اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے اس حالت سے چھٹکارا چاہیے۔'' راکیش کا ذہن پھر بغاوت پر اتر آیا۔

جنون جب حد کو پار کرتا ہے تو منطق اور معقولیت دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

اوراسی جذبے کی رو میں بہہ کر راکیش نے اپنی نوکری گنوادی تھی۔ پھرایم کام کی تیاری کرنے میں جٹ گیا۔ فارم بھرا، امتحان میں شریک ہوااورامیدوں کی گرہ باندھ کر رزلٹ کاانتظار کرنے لگا۔

سات جون کی صبح تھی۔ دودھ والے کی گھنٹی سنتے ہی ریکھا نے دروازہ کھولا اور ساتھ ہی اخبار اٹھا کر اندر لے آئی۔ اخبار میں ایم کام فرسٹ ائیر کا رزلٹ چھپا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اپنے پتی کے روکھے پن سے رنجیدہ ہونے کے باوجود وہ اس کا رول نمبر ڈھونڈنے لگی مگر وہاں تھا ہی کیا۔ اس کے چہرے کی طنابیں کس گئیں۔ غصے سے راکیش کو جگایا اور اس کے منہ پر اخبار پھینک کر چلانے لگی۔

''یہ لو، اپنے کرتوتوں کا پھل دیکھ لو۔ ڈھونڈلو اپنا رول نمبر اگر کہیں مل جائے تو۔ پورا ایک سال برباد کرلیا۔ نوکری بھی گئی اوراب دیکھو اپنا حال''۔

راکیش کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ اس نے اخبار پر جھپٹ کر سبھی کالموں پر اپنی نظریں بار بار دوڑائیں اور پھر منہ لٹکا کر رہ گیا۔ ادھر ریکھا اپنے آپ ہی بڑبڑاتی چلی جارہی تھی۔

''اچھی بھلی نوکری تھی۔ کلرک تھے تو کیا ہوا۔ وہاں بھی تو آگے بڑھنے کے چانسز تھے۔ اب کیا ملا۔ ناکامی! بے روزگاری! اور ملنا ہی کیا تھا۔'' کچن سے واپس آکر اس نے راکیش کے سامنے میز پر چائے کا کپ رکھ دیا اور بدستور بڑبڑاتی رہی۔ ''چلے تھے ڈگریاں لینے۔ ارے ڈگریاں لینی تھیں تو اسی ٹائم لیتے جب ڈگریاں لینے کا وقت تھا۔ اب شادی کے بعد یہ کوئی تک ہے۔ ڈگریاں لینے کے لیے انٹیلی جنس چاہیے۔ عزم چاہیے۔ ارادہ چاہیے اور سب سے بڑھ کر لگن چاہیے۔ ڈگریاں پیڑوں پر تھوڑے ہی اُگتی ہیں۔ پہلے اپنے اندر جھانکو۔ مشاہدہ نفس کرو۔ دیکھو، کیا میں اس لائق ہوں بھی یا نہیں۔ پھر میدان میں اُترو۔ کہیں لنگڑے گھوڑے بھی ریس میں اُترتے ہیں!''

بیوی کی ان چوٹوں کی تاب نہ لاکر آخر کار راکیش نے فرار کی سبیل ڈھونڈ ہی لی۔ وہ بنا کچھ بتائے غائب ہوگیا۔ ریکھا نے جو میز پر رکھا ہوا نوٹ پڑھا تو اس پر بجلی گر پڑی۔

اسے اس بات کا گماں بھی نہ تھا کہ راکیش ایسا سخت قدم اُٹھائے گا۔ اُسے ڈھونڈنے کی اس نے بہت کوشش کی۔ اخباروں میں اشتہار چھپوائے۔ ٹی وی پر ''تلاش گمشدہ'' کے تحت اس کی تصویریں دکھائی گئیں۔ مگر راکیش اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے چھپاتا پھرا جب تک کہ دنیا اس کو بھول نہ گئی۔ ریکھا کا ردعمل نیم پاگلوں جیسا تھا۔ مندروں میں شیو جی پر دودھ کی بالٹیاں انڈیل دیں۔ سادھوؤں، سنیاسیوں اور تانترکوں کے پاس حاضری دی۔ گوشت خوری چھوڑ دی۔ بالکل ویجی ٹیرین بن گئی۔ پہلے سوموار اور پھر شکروار کو بھی برت رکھنے لگی۔ مندروں کی گھنٹیاں بجاتے بجاتے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے مگر ان کے گنبدوں سے کوئی بھی بازگشت سنائی نہ دی۔

گو انسانی زندگی میں دو تین سال کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی تاہم اگر اس دوران بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوں تو ساری کایا پلٹ جاتی ہے۔ ریکھا نے اپنے اکیلے پن کی وجہ سے نوکری چھوڑ کر ایک پرائیویٹ اسکول میں ہیڈ مسٹرس کا کام سنبھالا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انتظامیہ نے اسکول کے ساتھ ملحق کوارٹر بھی دیدیا۔ پھر اسکول کی چپڑاسن دو وقت کی روٹی کے عوض گھر کا سارا کام کاج کرتی۔ وہاں راکیش نے بمبئی میں ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری کر لی۔ ساتھ ساتھ اس نے ایم کام کے امتحانات بھی دیئے۔ اور دو سال میں ہی ڈگری حاصل کر لی۔

ریکھا اپنے پتی کو بھولی نہیں بلکہ اس کی یادیں دل سے لگائے آسمانوں سے اس کی کامیابی کی دعائیں کرتی رہی۔ راکیش نے کمپیوٹر میں بھی خاصی مہارت حاصل کر لی اور دو ایک مہینے پہلے ہی اسسٹنٹ منیجر بن گیا۔ اس کی خود اعتمادی لوٹ کر آ گئی۔ وہ اپنی تنہائیوں کو دور کرنے کے لیے میرین ڈرائیو پر گھومتا رہتا۔ ایک روز اچانک اپنے ایک قریبی دوست سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں بمبئی کی سیر و تفریح کے لیے آیا تھا۔ کچھ اپنی سنائی کچھ اس کی سنی۔ اس نے ریکھا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور اپنی زندگی کے بارے میں ازسرنو سوچنے کی تاکید کی۔ واپسی پر دوست نے ریکھا کو بھی راکیش کی خیر خبر پہنچائی اور اس

کے ایڈریس سے آگاہ کردیا۔ ریکھا خوشی سے پھولی نہ سمائی جیسے اس کو کھوئی ہوئی جاگیر مل گئی ہو۔ اس نے الماری سے راکیش کا آخری نوشتہ نکالا اور پڑھنے لگی۔

ڈیئر ریکھا!

میں جارہا ہوں۔ مجھ سے یہ قیدیوں کی زندگی بسر نہیں ہوسکتی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا اس کا خمیازہ میں اکیلے ہی بھگتوں گا۔ تمہیں اس میں شریک نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ڈھونڈ نے کی کوشش نہیں کرنا، کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ ہاں ایک غلطی کا احساس ہورہا ہے جس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ ریکھا! تم میری طرف سے آزاد ہو۔ جب چاہے طلاق لے سکتی ہو۔ تم طلاق کے لیے کورٹ میں درخواست دے دینا۔ میری طرف سے کوئی عذر نہیں ہوگا۔

تم اپنے لیے پھر سے کوئی اچھا سا ہم سفر ڈھونڈ لینا۔ میں تو تمہارے لائق تھا ہی نہیں۔ ہاں ایک گذارش ہے میری جانب سے۔ اب کے کسی لوورڈویژن کلرک کو نہیں چننا۔ میں نے تو برداشت کرلیا شاید وہ خودکشی کر بیٹھے۔

تمہارا خیر طلب

راکیش

ریکھا اپنے آپ کو سنبھال نہ پائی۔ جلدی سے کاغذ قلم اُٹھایا اور راکیش کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔

ڈیئر راکیش!

تمہارا دوست کل ہی لوٹا ہے۔ تمہارے بارے میں سب معلومات فراہم ہوئیں۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تم نے اپنے آپ کو سنبھالا ہے اور خاصی ترقی پائی ہے۔

راکیش! جب گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے تو تم نے مجھے ایک نیا دوست ڈھونڈنے کی ہدایت کی تھی۔ میں نے تمہاری ہدایت پر پورا پورا عمل کیا اور اس نئے دوست سے کبھی کوئی ناانصافی نہیں برتی۔ وہ میرے جسم، میرے ذہن، اور میری روح کا ایک ناقابل تنسیخ انگ بن چکا ہے۔ جیسے میں ایک وقت سوچتی تھی کہ تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گی ویسے ہی اب ایسا لگ رہا ہے کہ میں اس کے بغیر جی نہیں سکوں گی۔ مگر دیکھو کتنے سال ہوگئے کہ تمہارے

بغیر ہی جی رہی ہوں اور ساری امیدیں اسی پر لگائے بیٹھی ہوں۔ انسان بھی کتنا خود غرض ہوتا ہے۔ جس سے پالا پڑتا ہے، جس کی کمزوریوں کا علم ہو جاتا ہے اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور جس کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا ہے اس سے آنکھیں بند کر کے آس لگاتا ہے۔

اس کا نام نہیں سنو گے۔ اس کا نام ہے 'روشن'۔ ویسے میں پیار سے اس کو 'رشو' کہتی ہوں۔ بالکل تمہاری طرح ہی شریر ہے۔ میری آنکھوں میں ہمیشہ کچھ کھوجتا رہتا ہے۔ شاید کوئی کمی محسوس کر رہا ہے۔ اسی کے کارن پہلی والی نوکری چھوڑ کر اب پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر رہی ہوں۔ آمدنی تو اتنی زیادہ نہیں ہے مگر آسائشیں کافی ہیں۔ ہاں ایک التجا ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو پرانی تلخیوں کو بھول کر اپنی زندگی کا ایک نیا ادھیائے شروع کر سکتے ہو۔ اگر میرے لیے نہ سہی تو رشو کے لیے ہی واپس آجاؤ۔ جب سے اس معصوم نے آنکھیں کھولیں ہیں وہ خلاؤں میں تمہیں ڈھونڈتا رہتا ہے۔ بہت چپ چاپ سا، کھویا کھویا گم صُم سا بیٹھا رہتا ہے۔

میں تمہارے خط کا انتظار کروں گی۔

تمہاری سدا تمہاری

ریکھا

ڈئیر ریکھا!

آخر کار تم بھی ٹپکل ہندوستانی عورت ہی نکلی جو کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی مدار کے اردگرد گھومنا پسند کرتی ہے۔ کہاں تو وہ باغی نسائیت کے خواب دیکھنے والی عورت اور کہاں یہ ستی ساوتری۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم بھی اپنے خول کے اندر ہی اندر دھنستی چلی گئیں اور پھر کبھی نہ نکلیں۔

ریکھا، میں نے تو آسمانوں میں کمندیں پھینک دیں۔ تم نے تو سنا ہوگا کہ میں نے ایم کام کر لیا ہے، کمپیوٹرس بھی کر لیا اور اب اچھی نوکری بھی مل چکی ہے۔ تنخواہ بھی خاصی اچھی مل رہی ہے۔ مہینے کے دس ہزار ملتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ بمبئی کے حساب سے یہ تنخواہ کچھ زیادہ نہیں۔ اس لیے چینج کے لیے مسلسل تلاش مین لگا ہوں۔ تاہم میں اب اپنے آپ کو تمہارے ہم پلہ سمجھ رہا ہوں۔ جب اپنا موازنہ تمہارے ساتھ کرتا ہوں تو کوئی کمی محسوس

نہیں ہوتی۔ اب کوئی احساس کم تری نظر نہیں آتی۔ اب تو مجھے کوئی بیوی کا ضمیمہ نہیں کہہ سکتا۔ اب بیل کی مانند مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت نہیں۔ میری اپنی ایک انفرادیت ہے۔ اپنا ایک وجود ہے۔ اس لیے مجھے اب تمہیں اپنانے میں کوئی دقّت نہیں ہے۔ تمبر اکتوبر میں پوجا کی چھٹیوں میں تمہارے پاس آؤں گا تب تک کے لیے انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

بہت سارے پیار کے ساتھ

تمہارا

راکیش

ڈیئر راکیش! خوش رہو!

تمہارا خط پڑھ کر مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ مسرت اس بات کی کہ تم میں وہ خود اعتمادی اب لوٹ آئی ہے جو تم نے خود ہی گنوادی تھی۔ اور حیرت اس بات کی کہ تم اب بھی اپنے گھر کو ایک تجارتی منڈی تصور کرتے ہو جہاں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ کمپٹیشن میں جٹے ہوئے ہیں۔ نہیں راکیش، تم غلط سوچ رہے ہو۔ ایک کنبے کے افراد کے بیچ میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہوتی۔

راکیش، پہلے خط میں تو میں نے تمہیں گھر واپس آنے کی تاکید کی تھی مگر آج روک رہی ہوں۔ بھگوان کے لیے تم مت آنا کیونکہ ایسی دھارنا لے کر تم بہت مایوس ہو جاؤ گے۔ راکیش اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم ایک فاتح کی طرح گھر لوٹ رہے ہو تو پھر نہیں آنا۔ تم حقیقت کا سامنا نہیں کر پاؤ گے۔ ہاں اگر تم صرف ایک پتی کے روپ میں واپس آنا چاہو تو میں تمہارے راستے میں آنکھیں بچھائے تمہارا انتظار کروں گی۔

بات دراصل یہ ہے کہ میں نے پچھلے دو سالوں میں اپنی تھیسز مکمل کر کے داخل کی تھی اور حال ہی میں مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل چکی ہے اور ساتھ ہی گولڈ میڈل بھی۔

فیصلہ میں تم پر چھوڑ رہی ہوں۔

تمہاری سدا تمہاری

ڈاکٹر ریکھا

☆☆☆

راکھ کا ڈھیر

گریزاں یادو! ذرا تھوڑی دیر ٹھہرو۔ آؤ بیٹھو میرے پاس ۔ کچھ اپنی سناؤ، کچھ میری سنو۔ میں کب سے تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں ہم اُمیدِ فردا کے سہارے جیتے ہیں۔ نہیں یہ سچ نہیں۔ میرا یہ ماننا ہے کہ ہم ماضی کی یادوں کے سہارے جیتے ہیں۔ زندگی جب کبھی بوجھ بن جاتی ہے ہم یادوں کے دفتر کھول کر ماضی کے تلخ وشیریں تجربات سے محظوظ ہوتے ہیں۔

اپنی ناکامیوں اور کامیابیوں کا بیلنس شیٹ! اور کچھ کھوئے ہوئے مواقع!

آج میں انہی بھولی بسری یادوں کو آواز دے رہا ہوں۔ زندگی کی پانچ دہائیوں کا سفر کرتے کرتے میں تھک کر چور ہو گیا ہوں۔ سود و زیاں کا جو احتساب کرنے لگا تو ترازو ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ کبھی یہ پلڑا بھاری اور کبھی وہ۔

میری ساری زندگی کا سرمایہ میرے کینواس ہیں جنہیں میں نے نمائش میں لگا رکھا ہے۔ ان کینواسوں پر میرے خواب' میری زندگی کے حسین ترین لمحات' مقید ہیں اور انہی میں میرے ارمان بھی دفن ہیں۔ یہ کینواس نہیں بلکہ میری حیات کے نقوش ہیں۔ یہ کینواس جو میری تخلیقات ہیں میرے لیے انمول ہیں۔

میرے ہم عصر جن دنوں آسماں کو چھوتی ہی کنکریٹ کی عمارتیں تعمیر کر رہے تھے' میں ان دنوں ان کینواسوں پر رنگ پوت رہا تھا۔ میرے ہم مکتب جس وقت زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے' میں اس وقت ان کینواسون کے ساتھ رنگوں کی ہولی کھیل رہا تھا۔

یہ کہانی سب سے پہلے لال بہادر شاستری اکادمی آف ایڈمنسٹریشن مصوری کے ان ہاؤس میگزین "چیتنا" کے لیے ۱۹۷۶ء میں لکھی گئی۔میں نے پہلی بار اس میگزین میں اردو حصہ شامل کروایا تھا۔

اور میرے ہم سن جب اسٹاک ایکسچینج میں بولیاں لگا رہے تھے تب بھی میں ان کینواسوں کو اپنے خون جگر سے رنگ رہا تھا۔ رنگ بھرتے ہوئے میں اکثر اپنے آپ کو بھول جاتا۔ کئی بار یہ رنگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایسے خلط ملط ہو گئے کہ پہچان کرنا مشکل ہو گیا۔ کئی مرتبہ اتنے پھیکے پڑ گئے کہ اپنی شناخت کھو بیٹھے اور کئی بار فاقوں سے نڈھال ہو کر مجھے ان رنگوں سے نفرت ہونے لگی۔ جنوں میں آ کر ان کینواسوں کو میں نے بارہا اپنے اسٹیڈیو سے باہر پھینک دیا مگر وہ اتنے ڈھیٹ ثابت ہوئے کہ ہر بار بے ضرر رہے۔ الٹے وہ مجھے ایسے گھورا کرتے جیسے میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ مجبور ہو کر مجھے ان کینواسوں کو اکٹھا کر کے واپس اسٹڈیو میں لانا پڑتا تھا۔

طالب علمی کے زمانے ہی میں میری تصویروں کی پہلی نمائش کلانکیتن کی معمولی سی آرٹ گیلری میں ہوئی تھی۔ ان دنوں دنیائے مصوری میں میری کوئی پہچان نہ تھی۔ ایک دوست کے مشورے پر میں نے اپنے اور اپنی تخلیقات کے بارے میں ایک رنگین پمفلٹ چھپوایا جس کے لیے مجھے قرضہ بھی لینا پڑا۔ دوست کا کہنا تھا کہ نمائش کرنے میں اسٹائل ہونا چاہیے۔ قرضہ تو دیر سویر اُتر ہی جائے گا۔ ورنہ آرٹسٹوں کی صف میں کھڑا ہونا ناممکن ہے۔ آخر ان کی بھی اَنا ہوتی ہے۔ وہ ہرا یرے غیرے نتھو خیرے کو اپنے ساتھ شامل نہیں ہونے دیتے۔ وہ تمہارے لیے اپنے سارے دروازے بند کر دیں گے اور تم اس گھٹن کو برداشت نہیں کر پاؤ گے۔

میں نے اپنے محسن کی بات رکھ لی۔ اپنے ایک دوست سے کچھ رقم ادھار لی۔ پانچ سو تشہیری پمفلٹ چھپوائے۔ کچھ پمفلٹ اخباروں اور رسالوں کے مدیروں کو بھیج دیئے اور باقی ماندہ آرٹ گیلری کے دروازے کے باہر رکھ دیئے۔ آرٹ گیلری میں وزِٹر آتے رہے، انہماک سے پمفلٹ اُٹھاتے رہے اور پڑھے بغیر ہی اپنی جیبوں میں ٹھونستے رہے۔ ماسوا چند ایک کے جن کے لیے یہ پمفلٹ پڑھنا ناگزیر تھا کیونکہ انہیں اپنے اخبار یا رسالے کے لیے ریویو لکھنا تھا۔

ان تین دنوں کے دوران نمائش دیکھنے کے لیے کتنے وزٹر آئے مجھے نہیں معلوم۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ ہلکی گلابی ساڑی میں ملبوس ایک نازک اندام لڑکی پہلے ہی دن گیلری میں وارد ہوئی تھی۔ گیلری تک چھوڑنے کے لیے اس کا شوفر اس کے ساتھ آیا تھا لیکن وہ دروازے پر ہی رُک گیا۔

ڈرائیور نے گیلری میں ٹنگی ہوئی سبھی تصویروں پر حقارت آمیز نظر دوڑائی۔ اس کے بعد راہداری میں گنیش مارکہ بیڑیاں پھونکتا رہا اور اپنی چابیوں کے گچھے کے ساتھ یوں کھیلتا رہا جیسے ان کی حقیقت تصویروں سے کہیں زیادہ مثبت ہو۔

لڑکی کوئی اور نہیں بلکہ شبنم تھی۔ درمیانی قد کی خوش طبع اور خوش باش گجراتی لڑکی جس کی لمبی گھنیری زلفیں اس کے کولہوں کا بار بار بوسہ لیتیں۔ نیلے ساگر جیسی نیم باز آنکھوں سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے خمیر میں ہی شراب گھلی ہو۔ کانوں میں لمبے مخروطی جھمکے اور گلے میں ڈائمنڈ کا جڑاؤ ہار سونے پر سہاگا کا کام کر رہے تھے۔ وہ ایک پینٹنگ کے سامنے بہت دیر کھڑی رہی اور اس کو مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی۔

پینٹنگ کا عنوان تھا۔ ''فلائٹ اِن ٹو اَن نون''۔ پینٹنگ میں رنگوں کی آمیزش کچھ ایسی تھی جیسے سبھی رنگ پنکھ لگا کر بے نام پرندوں کی مانند آسمانوں پر اُڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

شبنم جے جے اسکول آف آرٹ میں تقریباً دو سال گزار چکی تھی اور آخر کار پڑھائی نامکمل چھوڑ کر واپس دہلی آ چکی تھی۔ وہ تجریدی آرٹ کی اس کوشش کو سراہتی رہی اور علامتوں کے معنی ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے کیبن تک آ پہنچی۔ اندر آتے ہی اس نے میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کیے اور میں فرطِ انبساط سے پھولنے لگا۔

کیا وہ واقعی اچھے آرٹ کی مدّاح تھی یا یہ صرف ایک انٹیلیکچول سنابری تھی؟ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں نے باہر اسٹال سے چائے منگوائی۔ بارہ تیرہ سال کا ایک چھوکرا اپنے میلے کچیلے

ہاتھوں میں کیتلی اور گلاس اٹھائے ہمارے سامنے چائے رکھ کر چلا گیا۔ مجھے بہت خجالت محسوس ہوئی مگر شبنم نے بلا کسی جھجھک کے بڑے انہماک سے چائے پی لی۔ اس کی اس حرکت سے میں کافی متاثر ہوا۔

اس ملاقات کے بعد شبنم اور میں کئی بار ملے۔ کبھی تروینی میں، کبھی کافی ہاؤس میں اور کبھی چانکیہ آرٹ گیلری کے کینٹین میں۔ ہر بار میں اپنی تازہ تخلیق پر روشنی ڈالتا اور وہ جے جے اسکول میں گزارے حسین لمحات کے بارے میں بتاتی یا پھر آرٹ کے مختلف پہلوؤں پر بحث چھیڑتی۔ ابتداء میں مجھے اپنے اور شبنم کے درمیان کی خلیج کا احساس رہا لیکن شبنم کی سرکش شخصیت کو دیکھ کر آخر کار میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور ہم دونوں محبت کے عمیق سمندر میں ڈبکیاں لگانے لگے۔

شبنم میرے اسٹیڈیو میں بہت بار آئی۔ ماڈل بن کر کئی تصویروں میں اپنا تبسم بکھیرتی رہی۔ پینٹنگ کے لیے اتنا خوبصورت ماڈل ملنا بڑے ہی نصیبوں کی بات ہے۔ ان دنوں میری تصویروں میں ہر طرف گرم رنگوں کی بہتات نظر آتی تھی۔ غمِ روزگار اور غمِ دوراں دونوں سے میں غافل رہتا۔ ہم دونوں اپنے مستقبل کے میناروں کے خاکے بناتے رہے۔ یہاں تک کہ بچوں کے نام بھی طے ہوئے۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارا پہلا بچہ لڑکا ہوگا۔ میں اس کا نام آکاش رکھ لوں گی۔'' شبنم اس نام پر مُصر تھی۔

''نہیں پہلے لڑکی ہوگی۔ نام ہوگا شاملی'' میں نے بھی نام سوچ کر رکھا تھا۔

''ہونہہ جیسے تمہارے کہنے سے ہی بھگوان مان جائیں گے۔ پہلے تو لڑکا ہی ہوگا۔'' اس نے میری بات کاٹ لی۔

''ارے بابا، تمہاری بھی باری آئے گی۔ گھبراتی کیوں ہو۔ نو دس بچوں میں کوئی نہ کوئی لڑکا تو ہوگا۔'' میں نے شبنم کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''یو۔ ناٹی فیلو...!'' اس نے جھینپتے ہوئے اپنی ساری کا پلو دانتوں کے بیچ داب لیا۔

پھر ایک عرصہ تک اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ ایک روز سورت سے شبنم کا خط موصول ہوا۔ خط بہت دیر سے ملا۔ شادی کی تاریخ نکل چکی تھی۔ شبنم پنکج سیٹھ کی بیوی بن چکی تھی۔ خط میں وہ اپنی مجبوریاں اور لاچاریاں بیان کرتی رہی اور مجھے تسلیاں دیتی رہی۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے اندر ایک بہت بڑا تخلیق کار چھپا ہوا ہے۔ وہ ایک دن ضرور باہر آئے گا۔ میں اس دن کا انتظار کروں گی۔''

سات سال کے بعد میری تصویروں کی دوسری نمائش کا اہتمام تروینی میں ہوا۔ دریں اثنا میں نے کالج سے ڈگری حاصل کر لی تھی مگر روزی کمانے کی کوئی سبیل نہ ہو پائی۔ کہیں کہیں سے روزگار کے آفر ملے لیکن ان میں میری تذلیل کا سامان زیادہ اور میری ہنرمندی کی قدر کم ہوتی۔ جوالا ایڈورٹائزرس نے سائین بورڈ پینٹنگ کا کام سونپنا چاہا۔ ہوٹل پلازا انٹرنیشنل میں انگریزی خوشنویسی کا جاب ملا اور پھر سہارا آٹوموبائلز کے مالک نے تو حد ہی کردی۔ اس کو جب میری مالی بدحالی کی جانکاری ہوئی تو اس نے مجھ پر ترس کھا کر ٹرکوں اور گاڑیوں پر 'بری نظر والے تیرا منہ کالا' 'ٹاٹا۔ پھر ملیں گے' اور 'جیب کتروں سے ہوشیار' جیسے اشتہارات لکھنے کا کام دینا چاہا۔ دل پر پتھر رکھ کر میں نے ان سب آفرس کو ٹھکرا دیا اور صبر کے میٹھے پھل کا انتظار کرتا رہا۔ آخر کار سن رائز کمیونکیشنز کے آفس میں جونئیر آرٹسٹ کی اسامی پر اکتفا کرنا پڑا۔

تروینی میں شبنم بھی آئی تھی۔ اتفاقاً وہ انہی دنوں سیر و تفریح کے لیے دہلی میں وارد ہوئی تھی۔ بچوں کی بھی چھٹیاں تھیں۔ پنکج، شاملی اور آکاش کے ہمراہ وہ سیدھے میرے کیبن میں آگئی۔

انہوں نے اپنے بچوں کے نام ہمارے خوابوں سے مستعار لیے تھے جس سے صاف ظاہر تھا کہ شبنم نے اپنی محبت کے بارے میں اپنے خاوند کو آگاہ کیا تھا۔

''ہائے جے!'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''دیکھو تو میرے ساتھ کون ہے۔ پنکج... شاملی اور آکاش!'' وہ کچھ دیر رُکی اور پھر شاملی کی جانب مخاطب ہوئی۔ ''یہ ہیں تمہارے انکل،

روی جیکر.....ہی از اے گریٹ آرٹسٹ۔''

رہی سہی باتیں تروینی ریستوراں میں ہوئیں۔ وہاں معلوم ہوا کہ پنکج سیٹھ ہیروں کا تاجر ہے۔ سورت میں ہیرے تراشنے کی دو جرمن مشینیں لگوا رہا ہے۔ شادی ہوتے ہی اس نے بیوی کا دس لاکھ روپے کا بیمہ کروایا تھا۔ کچا ہیرا خرید کر سب سے پہلے وہ اُس کا بیمہ کرواتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ٹوٹنے سے محفوظ رہے بلکہ اس لیے کہ خدانخواستہ اگر اُس میں بال پڑ جائے یا پھر اس کی چوری ہو تو پنکج سیٹھ کو خسارہ نہ اُٹھانا پڑے۔ شبنم بھی اس کے لیے کچے ہیرے سے کچھ کم نہ تھی۔

شبنم میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اس کی ہنسی اور اس کے قہقہے غائب ہو چکے تھے۔ وہ متین اور سنجیدہ بن چکی تھی۔ جسم قدرے دُبلا ہو چکا تھا اور چہرے پر پیلاہٹ پھیل چکی تھی۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں اُٹھانے سے پہلے اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ڈھیر ساری دوائیاں نکال کر تین چار گولیاں منہ میں ڈال دیں۔

''یہ کیا.....؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔

''اوہ انکل، ڈونٹ بھی سرپرائزڈ۔ مما از اے لونگ فوسل۔'' شاملی بیچ میں بول پڑی۔

پھر معلوم ہوا کہ اس کے دو آپریشن ہو چکے ہیں۔ چھ مہینے پہلے ہی سلپ ڈسک کا آپریشن ہوا تھا۔ اس کی کمر میں اب بھی بیلٹ بندھی ہوئی ہے۔ وہ اب انہی دوائیوں کے سہارے جی رہی ہے۔ میں یہ سوچ کر حیران ہوا۔ کہ اتنی ساری دولت ہونے کے باوجود شبنم کی ایسی حالت ہے اور اس کا شوہر اپنی ساری پونجی سے بھی وہ پرانی شبنم واپس نہیں خرید سکتا۔

وہ مجھے ترستی نگاہوں سے ایسے گھور رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ روی مجھے اپنی دنیا میں واپس لے چلو۔ میں یہ گھٹن برداشت نہیں کر پاتی۔ تمہارے ساتھ رہ کر میری ایسی حالت ہرگز نہیں ہوتی۔''

پنکج سیٹھ بھی احساس گناہ کے سبب اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ''شکر کرو شبنم میرے پاس تھی۔ ورنہ ان بیماریوں سے اس کی جان چلی گئی ہوتی۔ میں نے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے اس کا معائنہ کروایا۔ حال ہی میں اس کا دوسرا آپریشن امریکہ میں کروایا۔ کسی اور کے ساتھ ہوتی تو کب کی سورگباش ہوئی ہوتی۔'' پنکج سیٹھ کا اشارہ شاید میری طرف تھا۔

ریستوراں سے واپس آکر میں ان کو اپنی پینٹنگز دکھانے لگا۔ شبنم تیسرے نمبر پر ٹنگی ہوئی پینٹنگ کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ اس میں ایک بسمل فاختہ آسمان کی اونچائیوں سے گر رہی تھی۔ اس کے پنکھ تتر بتر ہو کر ہوا میں بکھر رہے تھے۔ پس منظر میں کالے بادل منڈلا رہے تھے اور پیش منظر میں کانٹے دار جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ شبنم نے اپنے چشمے کو اپنی ساڑی سے صاف کر کے پینٹنگ کا عنوان پڑھا۔ ''دی فال''۔ وہ چونک گئی۔

ادھر پنکج سیٹھ بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یکبارگی وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''روی صاحب، آج کون سا دن ہے؟''

''برہسپت'' میں نے جواباً عرض کیا۔

''اوہ نو... آئی مسٹ گو بیک ٹو مارو۔ ٹائم کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ مجھے کل ڈائمنڈس کی ایک بہت بڑی ڈیل کے سلسلے میں جانا پڑے گا۔ کچھ لوگ فارین سے آرہے ہیں۔'' اس کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔ پھر وہ شبنم سے مخاطب ہوا۔ ''شبو، ہمیں جلدی کرنی پڑے گی۔''

شبنم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ ایسے فقروں سے مانوس ہو چکی تھی۔ اس کی نگاہیں جس پینٹنگ پر مرکوز تھیں اس میں ایک غریب افلاس زدہ کنبے کے افراد درشائے گئے تھے۔ ایک عورت تھی اور اس کے چار بچے تھے جن کے بدن پر بس نام کے لیے چند چیتھڑے تھے۔ آسمان پر پروشن بلیو اور ہلکے نارنجی رنگوں کے امتزاج سے ایسا سماں بندھا تھا جیسے سورج کچھ پل پہلے ہی ڈوب چکا ہو اور یہ سچ بھی تھا۔ سورج ڈوبنے سے چند منٹ پہلے ہی اس

عورت نے اپنے شرابی اوباش پتی کی چتا جلائی تھی جو ابھی تک سلگ رہی تھی۔ اس میں آگ کم اور دھواں زیادہ اُٹھ رہا تھا۔ شدید غم سے اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ کم سن بچے چتا کے سامنے بیٹھ کر آگ سے اپنے بدن گرما رہے تھے اور اُٹھنے کا نام بھی نہیں لے رہے تھے۔

آج پہلی بار اُن کے باپ نے، زندگی میں نہ سہی، کم از کم مرتے وقت ان کو راحت پہنچائی تھی۔ ماحول پر ہر طرف خاموشی، خوف اور غیر یقینیت طاری تھی۔ تصویر کے فریم پر جلی حروف میں عنوان لکھا تھا۔ ''ایک بندھوا مزدور کی موت''

پنکج سیٹھ کی بے قراری کو دیکھ کر شبنم اور آگے نہ بڑھ پائی۔ اس نے معذرت خواہ نظروں سے مجھے الوداع کہا۔ جاتے وقت شاملی اور آکاش جو الفاظ کہہ گئے وہ میرے کانوں میں دیر تک گونجتے رہے۔

''انکل، آپ کتنے اچھے آرٹسٹ ہیں۔ یو مسٹ ٹیچ اس ہو ٹو پینٹ۔''

اور اب اتنے سالوں بعد وہ پھر آئی تھی۔ ''لونگ فوسل'' مجھے شاملی کے وہ الفاظ، جو اس نے اپنی ماں کو چھیڑنے کے لیے استعمال کیے تھے، یاد آ گئے۔

میں رُوی جیکر، آئینے کے سامنے کھڑا اپنے آپ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وقت کے جیسے پر لگ گئے تھے۔ میرے اندر کا آرٹسٹ مجھ سے وداع ہو رہا تھا۔

روی جیکر اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے سر پر اور دراز ریش میں ایسا کوئی بال نہیں تھا جو کالا ہو۔ آنکھوں پر موٹا بائی فوکل چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ رنگوں کی پہچان کم ہونے لگی تھی۔ اب ان کا امتیاز کرنا بھی کٹھن ہو رہا تھا۔ روی جیکر، جو ہمیشہ اپنی تنہائی سے حظ اٹھاتا رہا اب پارکن سن بیماری سے پریشان تھا۔ کہیں کوئی آسرا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ کوئی نام لیوا نہ پانی دیوا۔ اپنے دل میں جھانک کر اس نے اعتراف کیا۔ ''اس حساب سے شبنم بہت دانا نکلی۔ کم سے کم کندھا دینے کے لیے آکاش تو ہے۔''

انہی خیالوں میں گُم روی جیکر کو شبنم کی آہٹ نے جگایا۔

''تم!'' روی جیکر نے حیران ہو کر شبنم سے سوال کیا۔

''ہاں میں.... کل تمہارے بارے میں انڈین ایکسپریس میں خبر چھپی ہوئی تھی۔ تم نے تو کمال کر دیا۔ تمہاری تخلیقات نے سارے عالم میں دھوم مچائی ہے اور مجھے خبر بھی نہیں۔ روی، میں کہتی تھی ناں کہ تمہارے اندر ایک بہت بڑا آرٹسٹ چھپا ہوا ہے۔ دیکھو، میری بات سچ نکلی۔''

روی جیکر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔ وہ جواباً کچھ نہ بولا۔

''روی۔ بعد میں تمہارے ریسپشن سے غیر حاضر ہونے کی خبر نے رنجیدہ کر دیا۔ تم اتنے بیمار تھے کہ ایوارڈ لینے بھی نہیں جا پائے اور مجھے اطلاع تک نہ دی''۔

روی جیکر ٹکر ٹکر شبنم کے پیارے پیارے چہرے کو دیکھتا رہا جس میں وہی پرانی شوخی اور مسخراپن عود کر آیا تھا۔ وہ تب بھی چپ رہا۔

''روی، تمہاری صحت کے بارے میں خبر پڑھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ بس نیکسٹ فلائٹ سے یہاں چلی آئی۔ آخر تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی؟

''کیوں تمہیں میرا دعوت نامہ نہیں ملا۔ میں نے تمہیں اس نمائش کا افتتاح کرنے کے لیے بلایا تھا۔'' روی جیکر اپنی وھیل چیئر کو نزدیک لے جا کر بولا۔

''اوہ ڈونٹ ٹیل می.... اٹ واز یور لیٹر۔ روی آئی ایم ویری سوری۔'' میں دراصل اُوٹی گئی تھی۔ چند دنوں کے لیے۔ پنکج کے بغیر اب گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ آکاش ایم بی اے کرنے کے لیے امریکہ چلا گیا اور پھر وہیں کا ہو گیا۔ شاملی ٹو از گان۔ شی از میریڈ۔ اس کا ہسبنڈ بھی اسٹیٹس میں ڈاکٹر ہے۔ اب میں ہوں۔ صرف میں۔ اور کوئی نہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں۔'' شبنم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''کل رات جب میں گھر لوٹ آئی تو انڈین ایکسپریس میں تمہاری نمائش پر لکھا ہوا ریویو دیکھا۔ تمہاری پینٹنگز کے فوٹو گرافس بھی چھپے تھے۔ اور پھر تمہاری صحت کے بارے میں تفصیل سے رپورٹ چھپی تھی۔ دل اتنا غمگین ہوا کہ جتنی بھی چٹھیاں میرا انتظار کر رہی تھیں سب کی سب میز پر پڑی رہیں۔ ان میں وہ دعوت نامہ بھی تھا۔ میرے تو ہوش ہی اُڑ گئے تھے، کھول کر دیکھ بھی نہ پائی۔

''شبنم، کل تو تم آ نہ سکی۔ مگر میں نے ایک مخصوص پینٹنگ ابھی تک ایگزبٹ نہیں کی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تم آ ؤ گی۔ اس لیے اُس پینٹنگ سے میں نے اب تک پردہ نہیں ہٹایا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس پینٹنگ کا پردہ اپنے دستِ مبارک سے ہٹا دو۔

''ٹھیک ہے، جو تمہاری مرضی۔'' شبنم نے جواب دیا اور روی جیکر کی وھیل چیئر کے پیچھے چلتی رہی۔

''شبنم ایک درخواست ہے۔ مجھ سے اس پینٹنگ کے بارے میں کچھ نہ پوچھنا۔ آئی جسٹ کانٹ ایکس پلین اینی تھنگ۔ اس پینٹنگ کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں نے اس پینٹنگ میں کن جذبات کی تصویر کشی کی ہے۔ کن مخلوقات کی منظر کشی کی ہے۔ کن محرکات نے مجھے اس پینٹنگ کو بنانے کے لیے مجبور کیا ہے، مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ آئی ہیو ریالائی زڈ دیٹ ان دس ورلڈ ایوری تھنگ از ابیس ٹریکٹ۔ ٹوٹل کنفیوژن۔ میں نے اس تصویر میں صرف رنگ بھر دیئے ہیں۔

شبنم نے پردے کی ڈورا پنے کانپتے ہاتھوں میں لے کر زور سے کھینچی۔ رنگوں کے طوفان نے اس کا سواگت کیا۔ شبنم نے جو فریم پر نظر دوڑائی وہاں جلی حروف میں لکھا تھا۔ ''راکھ کا ڈھیر''

اسی دن مشہور نقاد ڈی سوزا اپنے ڈسپیچ میں اس پینٹنگ کی تعریف میں یوں رقم طراز ہوا۔ ''روی جیکر کی زندگی کا یہ سب سے بہترین شاہکار ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ روی جیکر نے اب اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں کبھی بُرش نہ اٹھانے کی قسم کھائی ہے''۔

روی جیکر مر چکا ہے۔ گو میں اب بھی زندہ ہوں اور ان بیتی ہوئی یادوں کے سہارے باقی ماندہ دن گن رہا ہوں۔



مصنف کی تصنیفات

اردو:

- ادھورے چہرے (افسانوں کا مجموعہ)
- چنار کے پنجے (افسانوں کا مجموعہ)
- معیار و میزان (تبصرے) زیر طبع

ہندی:

- ادھورے چہرے (کہانیوں کا سنگرہ) زیر طبع

تقسیم کار

چنار پبلی کیشنز
73/7، منور ماوہار،
پٹہ بوڑی، تالاب تلو
جموں۔توی۔180002
موبائل۔09419101225, 09825604830
ای میل۔deepak_budki@yahoo.co.in

ادھورے چہرے۔مشاہیر کی نظر میں

- آپ کی زیرِ نظر کتاب کے افسانے اپنا الگ انداز رکھتے ہیں جن سے آپ کے شاندار مستقبل کی بشارت ملتی ہے۔ **(قتیل شفائی (مرحوم) پاکستان)**
- آپ کی کہانیوں میں اُتھل پتھل، ٹوٹ پھوٹ اور بے جوڑ شادیاں جو نا شادیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، پائی جاتی ہیں۔ **(ہرچرن چاولہ (آنجہانی) ناروے)**
- آپ کے لکھنے کا انداز بہت اچھا لگا۔ **(کالیداس گپتا رضا (مرحوم) ممبئی)**
- آپ کو کہانی کہنے کا سلیقہ ہے۔ آپ کا بیانیہ چست ہوتا ہے۔ زبان و بیان پر آپ کی گرفت ہے۔ مکالمے جاندار ہوتے ہیں۔ کرداروں کی تصویر کشی چابکدستانہ ہے۔

(مظہر امام۔نئی دہلی)
- آپ کے افسانے گہرے مشاہدے اور انسانی رشتوں کو سمجھنے کے عمل میں کامیاب تخلیقی ترسیل کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ **(بلراج کومل۔نئی دہلی)**
- یہ کہانیاں ہمیں آئینہ دکھاتی ہیں اور ان آئینوں میں اگر ہم اپنا بھیانک چہرہ دیکھنے کی اخلاقی جرأت پیدا کر لیں تو شاید ہمارے اعمال درست ہو جائیں۔

(سلطانہ مہر، برمنگھم برطانیہ)
- ان (دیپک بُدکی) کے مشاہدے کی قوت بہت تیز ہے اور سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ ان کا تخیل بھی ان کا ساتھ نبھاتا ہے۔ **(مانک ٹالا۔ممبئی)**
- آپ کے افسانوں سے آپ بیتی کا رنگ ٹپکتا ہے........آپ کی زبان صاف اور بامعنی ہے جس میں رطب و یابس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

(انور شیخ۔ کارڈف برطانیہ)

- سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ آپ کے پاس لکھنے کو بہت کچھ ہے اور اسے صفحہ قرطاس پر اتارنے کے لئے بے چین دل و دماغ بھی۔ 〈کنور سین۔نئی دھلی〉

- آپ کے افسانوں میں بھرپور زندگی اور حیات کی تلخیاں اور اونچ نیچ کے حوالے سے دردمندی اور انسانیت سے پیار و محبت رکھنے والا دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔

〈مقصود الٰھی شیخ۔بریڈفورڈ〉

- چھ مہینے پہلے میں نے آپ کی کہانی 'ڈرافٹ وڈ' پڑھی تھی۔ کہانی مجھے اتنی اچھی اور جاندار لگی کہ میں ابھی تک اس کے سحر سے پوری طرح آزاد نہیں ہو پایا ہوں۔

〈رفیق راز۔سرینگر، کشمیر〉

- افسانوں میں روایت کے بدلے جدت ہے اور زبان میں ایک تازگی ہے جو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ 〈ارجن دیو مجبور۔جموں〉

- ان (دیپک بُدکی) کے افسانے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کہانی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ 〈ڈاکٹر پریمی رومانی۔جموں〉

- دیپک بُدکی کی تحریروں میں ایک عجیب قسم کی سچائی ہے۔ ایک تلاش کا عمل ہے۔ میں اس کو اچھے ادب کی روح سمجھتی ہوں 〈سیّدہ نسرین نقاش۔سرینگر کشمیر〉

CHINAR PUBLICATIONS
73/7, Manorma Vihar
Patta Bohri, Talab Tilloo, Jammu - Tawi 180002 (India)